درس دھارا

شاہین عبّاس

شاہین عبّاس ایک ہمہ دَم مضطرب تخلیق کار ہے۔ اُس کے ہاں شاعری کرنا اَوٗ سانس لینا ہم معنی ہیں۔ اُس کا شمار ہم عصر دَور کے سَربَرآوُردہ غزل نگاروں میں ہوتا ہے؛ تاہم گزشتہ چند برسوں سے اِقلیمِ نظم میں بھی اُس کی تگ وتاز جاری ہے، جس کا ثمر "مُنادی" (۲۰۱۳) اَور "دَرَس دَھارا" کی صورت میں ہمارے سامنے ہے۔ مُنادی کی نظمیں پوسٹ نائن الیوین کے سیاق میں اپنی تفہیم کا تقاضا کرتی ہیں ___ یہ تماشا ابھی جاری ہے کہ ایک طرف امریکہ اور اُس کے حواری ہیں اَور دُوسری جانب اِسلامی دُنیا کے غبی حکمران اَور قابلِ رحم اَور بے سمت عوام!

"دَرَس دَھارا" کی بیشتر نظمیں اِسی بُحران کا رثائی اَوٗ احتجاجی بیانیہ ہیں مگر اِن میں مقامیت کا عُنصر حاوی ہے۔ مطلب یہ نہیں کہ یہ نظمیں ایک ہی موضوع کی اَسیر ہیں؛ متعدد نظمیں ایسی ہیں جن میں شاعر نے اپنے ماضی کے کچھ کِرداروں کی بازیافت کی ہے: جیسے "مستری بندے علی"، "کاکا نواب"، "ولیا"، "ناظرہ بی بی"، "قاسم شاہ" اَور "خورشید بی"۔ ہوسکتا ہے، یہ کِردار فرضی ہوں یا بدلے ہوئے ناموں کے ساتھ جلوہ گر ہوئے ہوں۔ یہاں شاہین کے باطن میں موجود اَفسانہ نگار اَوٗ شاعر بغل گیر ہوتے دِکھائی دیتے ہیں ___ نظم کی یہی خوبی شاعر کو کُھل کھیلنے کا موقع فراہم کرتی ہے۔ دِھیمے مزاج کے شاہین عبّاس نے اِس سنگم سے خوب خوب فائدہ اُٹھایا ہے۔ اِن نظموں میں غُصّے کی شِدّت اَور طنز کی کاٹ بھی آسانی سے محسوس کی جاسکتی ہے۔ مجھے کامیو کا ناوِل "زوال" اَوٗ ولہلم رائخ کی کتاب (Listen, little man!)

←

درس دھارا

شاہین عبّاس

درس دھارا ـــ نظمیں ـــ شاہین عباس

وسیم جگنو نے ٹی جے پرنٹرز، لاہور سے چھپوا کر
کاغذی پیرہن، رائل پارک، لاہور سے شائع کی۔

اشاعتِ اوّل	:	۲۰۱۴ء
مشینی خطاطی	:	ورڈ میکرز
سرورق	:	ششدر
تعداد	:	۵۰۰
قیمت	:	۳۵۰ روپے

Dares Dhara
(*Urdu* Poems by *Shaheen Abbas*)

Printed by:
TJ Printers, Lahore, Pakistan

Price:
In Pakistan: Rs.350.00
Abroad: US$.10.00 or Euro.8.00 or Poundsterling.7.00

Published by:
Kaghadhi Paerahen
Azeem Mansion, Royal Park
Lahore, Pakistan
Contact: +92.321.4649684
Email: kaghadhipaerahen@hotmail.com

کاغذی پیرہن
KAGHADHI PAERAHEN

ISBN 978-969-8527-86-0

تقسیم کار:

سانجھ
SANJH PUBLICATIONS

بک سٹریٹ 46/2 مزنگ روڈ لاہور
فون 042-37355323 فیکس 042-37323950
ای میل sanjhpks@gmail.com, sanjhpk@yahoo.com
ویب سائٹ www.sanjhpublications.com

حمیرا کے نام

درس دھارا

شاہین عباس کی نظمیں

شاہین عباس معاصر غزل گو شاعروں میں ممتاز شناخت رکھتے ہیں۔ گزشتہ کچھ عرصے سے وہ غزل کے ساتھ ساتھ نظم کی طرف متوجہ ہوئے ہیں۔ "مناوی" کے نام سے اُن کی نظموں کا پہلا مجموعہ ایک ڈیڑھ برس پہلے شائع ہوا۔ اب وہ نظموں کا دوسرا مجموعہ منظرِ عام پر لا رہے ہیں۔ گویا وہ مسلسل نظمیں تخلیق کر رہے ہیں۔ ایک جیسے ارتکاز اور سنجیدگی کے ساتھ 'غزلیں اور نظمیں' لکھنے کا صاف مطلب یہ ہے کہ وہ غزل و نظم کی شعریات میں کسی تناقض کے قائل نہیں۔ غزل کی 'ہیئتی نارسائیوں' کے نام پر جدید نظم کے شعرا کی غزل کی مخالفت' اور غزل گو شعرا کی طرف سے جدید نظم کو ثقافتی وجمالیاتی طور پر اجنبی سمجھے جانے اور مردود ٹھہرانے کی باتیں اب بھی کہیں نہ کہیں گونج پیدا کرتی ہیں۔ ترقی پسندوں اور جدیدیوں میں بھانت بھانت کے اختلافات تھے' مگر دونوں مکتبہ فکر نے غزل و جدید نظم کو ایک دوسرے کا مدمقابل بنا کر پیش کیا' اس فرق کے ساتھ کہ ترقی پسند غزل کو جاگیردارانہ عہد کی ترجمان صنف سمجھتے تھے اور جدیدیے' غزل کی 'ہیئتی نارسائیوں' کے نقاد تھے۔ علاوہ ازیں غزل کی کلاسیکی روایت کے پاس دار بھی جدید نظم کے کٹر مخالف تھے۔ ہر چند رفتہ رفتہ دونوں اصناف کی کشمکش کم ہوتے چلی گئی۔ ترقی پسندوں اور جدیدیوں کی پہلی نسل کے بعض ممتاز شعرا نے نظم کے ساتھ ساتھ غزل بھی کہی' تاہم دونوں میں جس مغائرت کو ایک مرتبہ فرض کیا گیا' اس کا اثر اب بھی کہیں نہ کہیں دکھائی دیتا ہے۔ معاصر اُردو غزل کے کچھ ممتاز ترین شاعر نظم کی شعریات کو یا تو قبول نہیں کرتے' اور کبھی فراخ دلی کا مظاہرہ کرتے بھی ہیں تو نظم سے اُسی "لطفِ سخن" کا مطالبہ کرتے ہیں جو غزل سے مخصوص ہے۔ اسی طرح معاصر نظم کے کچھ اہم ترین شاعر غزل سے دلچسپی ہی نہیں رکھتے۔ کچھ نظم گو' ذائقے کی تبدیلی کے لیے غزل کہہ لیتے ہیں' مگر وہ ایک طرح سے غزل کہنے کی مشق (یا مشقت) ہوتی ہے۔ اسی دوران میں گلوبلائزیشن کے اثر سے یہ بحث بھی شروع ہوئی کہ کیا غزل عالمی ادبی دھارے کا حصہ بن سکتی ہے....... اس بحث میں بنیادی مفروضہ یہ تھا کہ نظم دُنیا بھر میں لکھی جاتی ہے' مگر غزل جنوبی ایشیا کی چند ایک زبانوں تک محدود ہے (ایران میں بھی غزل کم کم لکھی جاتی ہے)۔ اس بحث نے غزل و نظم کی پُرانی کشمکش کو ایک بار پھر زندہ کر دیا مگر اب ایک نئے تناظر میں (یہاں اس بحث پر تفصیل سے لکھنے کی گنجائش ہے نہ محل)' غزل و نظم کی رزم آرائی کا ذکر اس لیے کرنا پڑا کہ غزل کے ایک پختہ کار شاعر کا نظم کی طرف آنا اور گہرے ارتکاز اور غیر معمولی سنجیدگی کے ساتھ نظمیں تخلیق کرنا ایک

واقعہ ہے: یعنی اُنھوں نے فقط ذائقے کی تبدیلی کے لیے نظمیں نہیں لکھیں (جیسا کہ اکثر غزل گو ذائقہ بدلنے کے لیے نظمیں لکھ لیتے ہیں)۔ چونکہ وہ غزلیں بھی لکھ رہے ہیں' اس لیے ہم یہ نہیں کہہ سکتے کہ اُنھیں تنگنائے غزل کا احساس ہُوا اور وہ نظم کی طرف راغب ہوئے۔ اُن کی نظمیں پڑھتے ہوئے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اُنھیں اپنے شعری وجود میں اچانک کسی گہرے گھاؤ کا تجربہ ہُوا اور یہی گھاؤ نظم کا سرچشمہ بن گیا ہے۔ کسی صنف کی شعوری اہمیت کا احساس نہ تو دیرپا ہوتا ہے' نہ ذات و دُنیا کے بنیادی گہرے مسائل کو اُس صنف میں پیش کرنے کا سبب بن سکتا ہے۔

شاہین عبّاس کی نظموں کے بارے میں یہ بات تیقّن کے ساتھ کہی جاسکتی ہے کہ اُن میں ذات و دُنیا اور ورائے ذات و ورائے دُنیا کے مسائل و معاملات کو پیش کیا گیا ہے...... یہ مسائل و معاملات اس دُنیا' اس مابعد جدید زمانے سے بھی متعلق ہیں' اور کہیں کہیں تجریدی نیم مابعدالطبیعیاتی رُخ بھی اختیار کر گئے ہیں' مگر اُنھیں ایک شخصی زاویے سے دیکھا گیا ہے...... دوسرے لفظوں میں شاہین عبّاس کی نظمیں بیگانگی کی نظمیں نہیں ہیں۔ ان نظموں میں ہمیں ایک ایسا شخص کلام کرتا محسوس ہوتا ہے جو دُنیا و زمانے اور خُدا و غیاب دونوں سے داخلی طور پر وابستہ ہے۔ یہ شخص زیادہ تر متکلم کے صیغے میں کلام کرتا ہے۔ اسے اپنی ذات میں وہ رخنے محسوس نہیں ہوتے جن کی وجہ سے آدمی کی کثیر متنوع متضاد شناختیں پیدا ہوتی ہیں۔ تاہم کہیں کہیں یہ شخص غائب کے صیغے میں بھی اظہار کرتا ہے۔ یعنی کبھی تو یہ اپنی پُرتیقّن آواز میں کلام کرتا ہے' اور کبھی ایک تماشائی کے طور پر دُنیا و ورائے دُنیا کے قصّے سناتا ہے۔ دونوں صُورتوں میں اس کی ذات کی وحدت برقرار رہتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ان نظموں کی مخصوص تکنیک ہے۔ تقریباً تمام نظمیں کسی حسّی تمثال' کسی مانوس منظر' کسی جانے پہچانے واقعے سے شروع ہوتی ہیں' اور اپنے اندر سے ورائے حسّی دُنیا کی طرف جست بھرنے لگتی ہیں۔ ان نظموں کی خصوصیت یہ ہے کہ حسّی دُنیا سے ورائے حسّی دُنیا کی طرف جست' ترکِ دُنیا جیسی نہیں۔ تمام نظمیں ایک دائرہ مکمل کرتی محسوس ہوتی ہیں۔ یعنی یہ جانی پہچانی دُنیا سے نامانوس' تجریدی دُنیا سے واپس حسّی دُنیا کی سمت پلٹتی ہیں۔ یوں دونوں دُنیاؤں میں رفت و آمد کا ایک سلسلہ قائم ہوتا ہے۔ اس سلسلے کو پوری طرح گرفت میں لینے میں کئی مقامات پر قاری کو مشکل بھی ہوتی ہے' مگر یہ مشکل اُس وقت دُور ہو جاتی ہے' جب دونوں دُنیاؤں میں آمد و رفت کا دائرہ مکمل ہوتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ شاہین عبّاس کی نظمیں جس تکنیک کے تحت لکھی گئی ہیں' اُس سے نظم ایک کُل میں ڈھل جاتی ہے۔ اس ضمن میں دو باتیں پیشِ نظر رہنی چاہییں۔ اوّل یہ کُل میکانکی نہیں...... میکانکی کُل میں خالی جگہیں نہیں ہوتیں' نظم کے سب اجزا ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملائے ہوتے ہیں۔ عموماً کلاسیکی نظمیں اسی میکانکی کُل کی حامل ہوتی تھیں' جبکہ غیر میکانکی کُل کی حامل نظم کے مصرعوں اور ٹکڑوں میں خلا' شگاف ہوتے ہیں' جنھیں بھرنے کے قرینے خود اُنھیں مصرعوں' ٹکڑوں میں موجود یا مضمر ہوتے ہیں۔ دوسری یہ بات قابلِ توجہ ہے کہ نظم کے غیر میکانکی کُل کا تعلق نظم کے متکلم کی ذات کی وحدت سے ہے۔ نظم کے متن میں تنظیم و انتشار' اُس

کے متکلم (خدا/اسے شاعر کے ساتھ گڈمڈ نہ کیجیے) کے داخلی ربط و انقطاع کی نسبت سے قائم ہوتا ہے۔ اس ضمن میں شاہین عباس کی نظم "نظم میں خالی جگہیں" خاص طور پر قابلِ ذکر ہے۔ اس نظم کا متکلم اس بات پر تاسف کرتا محسوس ہوتا ہے کہ نظم کی خالی جگہیں نہیں بھری جا سکیں۔ یہ ابتدائی مصرعے دیکھیے: نہیں ہم نہیں بھر سکے ہیں شعر / شاعری کی قسم / شاعری کا شکوہ / رہم نہیں کر سکے حرف اور حرف کو / خطِ مابین کے ماسوا ہے ہم / نظم کو ہم خدا سے ملانے چلے!

بہ ظاہر یہ نظم ایک آدرشی جدید شاعر کا اظہارِ عجز ہے کہ وہ حرف اور ورائے حرف کے درمیان کی خالی جگہ کو نہیں بھر سکا یعنی نظم کو خود نظم کے خدا سے نہیں ملا سکا۔ ابھی اس نظم میں ظاہر ہونے والے خدا کے تصور پر دھیان نہیں کیجیے، صرف یہ دیکھیے کہ شاعر نے نظم ختم کہاں کی ہے: شعر کا ایک اپنا حرم تھا / حرم کیا تھا / پردہ / پردہ کی تھی / چوٹی کے اس رخ پہ کیا جانے / کیا ہو گیا / نظم کا ایک اپنا خدا تھا / رفو ہو گیا!

آپ نے ملاحظہ کیا نظم نے ایک دائرہ بنایا، یعنی خالی جگہ کے تصور کو مکمل کیا۔ اسی طرح نظم "یہی نظم باقی بچی ہے" دیکھیے۔ اس کے ابتدائی مصرعوں کو ملاحظہ کیجیے: تم نے ماچس بنائی / مرے ہاتھ آئی۔ اب آخری لائنیں دیکھیے: خدا / تم نے ماچس بنائی / جو میرے تمہارے بہت کام آئی۔ یہی صورت ہمیں اُن کی اکثر نظموں میں دکھائی دیتی ہے۔

شاہین عباس نظم میں خالی جگہیں تخلیق کرتے ہیں یعنی اُن کی نظم کی گفتگو سپاٹ اور اکہری نہیں ہوتی؛ اس گفتگو کے بیچ میں خاموشی کے کچھ وقفے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ جسے ہم آرٹ کہتے ہیں، وہ خاموشی اور خالی جگہوں میں ظاہر ہوتا ہے۔ اگر کوئی نظم مسلسل گفتگو کا تاثر پیش کرے، اور اُس کے بیچ میں کہیں خاموشی کا وقفہ نہ آئے، نیز اس گفتگو میں مصنف وخیال ونظریے کی موجودگی ہی موجودگی ہو اور ان کی غیاب، خلا، عدم نہ ہو تو وہ نظم محض شور ہے (شور انگیز نہیں)، یا اُس شور کی ترجمان ہے جسے ہم روزمرہ زندگی کی چیخم دھاڑ کی صورت سنتے رہتے اور الامان الحفیظ کہتے رہتے ہیں۔ آرٹ کا جمال ہمیشہ متن کی اوٹ میں، متن کی اَن کہی میں یا پرانی زبان میں اشاریت و رمزیت میں ہوتا ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ نظم کی خالی جگہوں کو بھرا کیسے جائے، یا خاموشی کی معنی یابی کیونکر ہو! چونکہ نظم کی خاموشی نظم کی گفتگو کے بیچ ہی میں ہوتی ہے، اس لیے اسے گویا بنانے کا سامان بھی نظم ہی میں موجود ہوتا ہے۔ نظم کی خالی جگہ کو کسی مماثل شے ہی سے بھرا جا سکتا ہے۔ جہاں سے نظم کے موجود کا سرا اچانک غائب ہوتا، اور ایک عدم سا ظہور کرتا ہے، اور قاری کو اچانک جھٹکا سا لگتا ہے، وہیں کچھ ایسے اَلفاظ (زیادہ مناسب لفظوں میں سگنی فائر) ہماری راہ نمائی کرتے ہیں، جو نظم کے بنیادی تھیم سے خالص لسانی نشانیاتی رشتہ رکھتے ہیں۔ اَلفاظ کا لسانی نشانیاتی رشتہ فکری رشتے سے مختلف ہوتا ہے۔ بعض اوقات کسی نظم کے کچھ حصے نظم کے تھیم سے بہ ظاہر جُدا ہوتے ہیں، مگر اُن حصوں میں پیش ہونے والی فکر نظم کے تھیم سے متعلق ہوتی ہے۔ مثلاً میراجی کی نظم "لذت کی بیچارگی" کے یہ ٹکڑے دیکھیے:

ابتدا میں صرف انجانی نگاہوں کی کہانی تھی مگر
نرم آوازوں کی موت آ گئی
دور سونی دور ساگر لہر سے ہر اک کرن تھی دور دور
ہاتھ کے پاس آیا تو ہاتھ سوچ کر
جیسے جنگل کی فضا میں سر و نابینا چٹانوں سے گرے
دور بستی سے دور آبشار

ان ٹکڑوں کے درمیان خلا ہیں، مگر ان خلاؤں کو نظم کے بنیادی تھیم کی مدد سے بھرا جا سکتا ہے، جو عبارت ہے ''حسی لذت کی ثنویت اور اُس کی تکمیل پر پیدا ہونے والی بے چارگی'' سے۔ یعنی ان مختلف ٹکڑوں کو باہم جوڑنے کا سامان نظم کی ''فکر'' میں ہے۔ اگر یہ فکر اوجھل رہے تو نظم منتشر ٹکڑوں کا تاثر ابھارتی ہے۔ دوسری طرف نظم کے اجزا میں لسانی، لسانیاتی رشتے نظم کے تھیم کی مختلف جہات کو روشن کرتے ہیں خصوصاً وہ جہات جو تاریکی میں ہوتی ہیں یا جنھیں نظم کے متکلم نے اپنے مخاطباتی عمل (rhetorical practice) سے دبایا ہوا ہوتا ہے۔ ہم شاہین عباس کی نظم کو اس مفہوم میں مابعد جدید نظم کہہ سکتے ہیں کہ یہ لسانی تشکیل ہونے کا گہرا تاثر دیتی ہے۔ ان کی نظم اپنی قرأت کے دوران میں قاری کو مجبور کرتی ہے کہ وہ اپنی توجہ اُن تمثالوں استعاروں پر مرکوز رکھے جو اصل میں زبان کی معنی سازی کی قوت کا اظہار ہیں۔ اس کا یہ مطلب نہیں کہ اُن کی نظم محض ایک تخیلی لسانی ہیئت ہے اور خارجی حقیقی دنیا سے بے تعلق ہے۔ یوں بھی کوئی لسانی متن خارجی حقیقی دُنیا سے غیر متعلق نہیں ہو سکتا؛ زبان میں کوئی ایسا لفظ موجود نہیں جس کے معانی باہر کی دُنیا کو روشن نہ کرتے ہوں یا اُس کا عکس نہ ہوں۔ حقیقتاً ہمارا کوئی لسانی اظہار خواہ وہ تخلیقی ہو یا علمی، زبان کی خطابت کو بروے کار لائے یا اس کی استعاراتی جہت کو، وہ باہر کی دُنیا سے متعلق ہوتا ہے۔ اصل یہ ہے کہ زبان کو بروے کار لانے اور مختلف و متنوع تاثرات و معانی پیدا کرنے کے امکانات ہوتے ہیں۔ زبان کا ایک استعمال یہ ہے کہ زبان خود پس منظر میں چلی جاتی ہے، اور معنی و مفہوم پیش نظر رہتا ہے؛ دوسرا استعمال اس کے برعکس ہے، جہاں مفہوم پس منظر میں (ایک مبہم دھندلی فضا میں) چلا جاتا ہے جبکہ خود زبان کا ہونا (being) پیش منظر میں آ جاتا ہے۔ پہلی صورت میں زبان خود صرف ہو جاتی ہے، اور واحد معنی بچ رہتا ہے، مگر دوسری صورت میں زبان کی معنی سازی کی قوت اپنا اظہار کرتی ہے، مبہم دھندلی فضا میں پہنچنے والے معانی رفتہ رفتہ لَو دیتے ہیں اور ایک قسم کی تکثیریت کو پیدا کرتے ہیں۔ شاہین عباس کی نظموں میں زبان کا یہی دوسری قسم کا استعمال ملتا ہے۔ کہنے کا مطلب یہ ہے کہ اُن کی نظموں کے مصرعے جس معنی و مفہوم کے حامل ہیں، وہ پس منظر میں ہے، مگر انھیں لسانی طور پر تشکیل دینے کا عمل پیش منظر میں ہے۔ یہ بھی کہہ سکتے ہیں کہ شاہین عباس کی نظم سگنی فائیڈ سے زیادہ سگنی فائر کو اہمیت دیتی ہے، لفظ کی حسی مادی موجودگی کو پیش منظر میں رکھتی ہے مگر لفظ کے ذہنی و تخیلی پہلوؤں کو اوٹ میں خاموشی میں مبہم دھندلی فضا میں جگہ دیتی ہے۔ اُن کی نظم جس کُل کو تشکیل دیتی ہے، اُس کو ہم نظم کے

لسانی نشانیاتی رشتوں کو سامنے رکھ کر سمجھ سکتے ہیں۔ اس نکتے کو واضح کرنے کے لیے اُن کی نظم ''ناخواندہ بھی خواندہ'' دیکھیے:

میں جب بھی نظم لکھنے بیٹھتا ہوں / اندھیرے ہی میں لکھتا ہوں
اندھیرے میں لکھی نظموں کو لکھنا ہی نہیں پڑتا
سویرے جیسے جو لکھ پڑھ نہیں سکتے / اندھیرا سے اچھی نظم ہے اُن کی
اچانک گفتگو کے غیب میں آغاز ہوتی ہے
کوئی پچھڑوں جیسا قرنوں جیسا اوقات کا کا!
شروع نظم سے مصرع بہ مصرع اپنی آوازیں لگاتا
خامشی سیٹیوں کو گاتا آتا ہے
اور نظم کے سائے ابھر آیا وقت میں گھل سا جاتا ہے
چلو...... انگنھرا لے کالے سے یہاں گالی پہ گالی کون کھائے گا
اندھیرے گاں چلتی ہے / ادھر ہر سطر استبداد چل پڑتی ہے
دو اور دو کے جوڑوں میں
اندھیرے کون چلتی ہے۔ کہیں کس سے ان
اور اس طرف سطروں کی سطریں
نولیوں میں جھول جاتی ہیں۔ ہاتھ سے ان
ورق کے وسط میں اس نظم کا بھی وسط آیا / درمیاں آیا اندھیرے کا
یہاں پر نظم کو اک بار دو حرفی آ پڑتی ہے
کوئی بارہ دری ہے جس کا اپنا درمیاں ہے
شروع ہوتا ہے مشرقوں کے مغربوں کے اس کے اتنے مسئلے ہیں
کہ جتنے نظم کے ہیں / موزوں بات پوری کرنے کی جلدی میں ہے
ابھی کچھ دیر میں / بس چار تھے چالوں کی ڈوری پر
مگر اک ایک کر کے بارہ دروازوں پہ
بارہ باتوں کے پردے گرائے گا
اندھیرے کے مکمل ہونے کا اعلان ہوگا / نظم کا انجام ہوگا!

یہ نظم کس سے متعلق ہے...... کیا نظم لکھنے کے عمل سے؛ اندھیرے سے؛ یا اندھیرے میں نظم لکھنے کے عمل سے...... اگر اس نظم کا بنیادی موضوع اندھیرے میں نظم لکھنا ہے تو آخر نظم اور اندھیرے میں کیا مماثلت ہے کہ اندھیرے ہی میں ایسی نظم لکھی جا سکتی ہے جسے خواندہ و ناخواندہ بیک وقت پڑھ سکتے ہیں؟ یہ تمام سوالات نظم پڑھتے ہوئے ذہن میں پیدا ہوتے ہیں۔ یہ سوالات اِس لیے پیدا نہیں ہوتے کہ نظم کا لہجہ استفہامیہ ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ پوری نظم اثباتی مصرعوں پر مشتمل ہے؛ اس کے باوجود نظم کی تفہیم مذکورہ استفہامیوں کے بغیر ممکن نہیں ہوتی۔ کیوں؟ پہلی بات یہ کہ نظم کسی مانوس خارجی واقعے کی عکاس نہیں۔ جو نظمیں جانے پہچانے واقعے؛ شناسا

تجربے یا معلوم کیفیت کو پیش کرتی ہیں' وہ فی الفور سمجھ میں آجاتی ہیں۔ حقیقتاً اُن کے لیے ''سمجھ میں آجانے'' کی ترکیب استعمال نہیں کرنی چاہیے: وہ اصل میں ہماری معلوم و مانوس دُنیا کی تائید و توثیق کرتی ہیں اور ہمیں اُس ممکنہ صدمے سے محفوظ رکھنے کا کام کرتی ہیں جس کا خدشہ کسی اجنبی' انوکھی صورت حال یا متن کا سامنا کرنے سے ہو سکتا ہے: جبکہ وہ نظمیں جن میں واقعے کی عکاسی کے بجائے' واقعے کی تعبیر کی گئی ہو' ہمیں صدمہ پہنچاتی ہیں ۔ جیسا کہ شاہین عباس کی زیرِ بحث نظم میں جگہ جگہ صدمہ انگیز مصرعے ہیں: مثلاً یہ مصرعے:
اندھیرے میں لکھی نظموں کو لکھنا ہی نہیں پڑتا / سو میرے جیسے جو لکھ پڑھ نہیں سکتے / اندھیرا سب سے اچھی نظم ہے اُن کی / اچانک گفتگو کے غیاب میں آغاز ہوتی ہے۔ ابھی جس صدمے کا ذکر ہوا ہے' وہ دراصل ''اندھیرے''' ''لکھنے'' اور ''نظم'' کے سگنی فائر کی ایک عجب تکرار سے پیدا ہوا ہے۔ اکثر کچھ لفظوں کی تکرار کسی ایک معنی کے اصرار پر منتج ہوتی ہے' مگر یہاں تکرار سے معانی معرضِ التوا میں ہیں یا یہ کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ سگنی فائر کی تکرار سے سگنی فائیڈ بے مرکز ہو رہا ہے۔ اندھیرے میں لکھی نظموں کو لکھنا ہی نہیں پڑتا ۔ اس مصرعے میں لکھنا تحریر کرنے کا معنی بھی دے رہا ہے اور تقریر کا بھی۔ یعنی اندھیرے میں کہی گئی (بولی گئی' تقریر کی گئی) نظم لکھے جانے سے بے نیاز ہوتی ہے۔ تحریر' روشنی' روشنائی' قرطاس و قلم تو چاہتی ہی ہے' لکھنے کے عمل کا بھی تقاضا کرتی ہے؛ سو لکھنے میں کئی تجنیسیں ہیں' جبکہ تقریر صرف لفظ اور متکلم چاہتی ہے۔ روشنی و روشنائی' قلم و قرطاس کی عدم موجودگی کا دوسرا مطلب اندھیرا ہے' لہٰذا یہاں اندھیرے سے مراد صرف رات کی تاریکی نہیں' اُن سب رسمیات و تکلفات کی عدم موجودگی ہے جو نظم لکھنے کے لیے درکار ہیں۔ یہ رسمیات و تکلفات نظم کی دُنیا کو محدود بھی کرتے ہیں کہ صرف خواندہ ہی نظم کی دُنیا میں داخل ہو سکتے ہیں جبکہ ''اندھیرا نظم'' ناخواندہ کو اپنی دُنیا میں داخلے کا پروانہ دیتی ہے۔ نیز ''اندھیرا نظم'' گفتگو کے غیاب سے اچانک آغاز ہوتی ہے۔ گفتگو کا غیاب خاموشی ہے۔ یہ خاموشی لفظ کا نہ ہونا' نہیں' یہ لفظ اور لفظ کے بیچ کا وقفہ ہے۔ چنانچہ ''اندھیرا نظم'' لفظ اور لفظ کے بیچ کی خالی جگہوں سے اچانک شروع ہوتی ہے۔ پھر یہی خاموشی' یہی خالی جگہیں پوری نظم میں پھیل جاتی ہیں۔ آگے نظم میں جہاں بارہ دری کا ذکر آتا ہے' وہ بھی دراصل اُنھیں خاموشیوں اور خالی جگہوں کا استعارہ ہے۔ اندھیرے میں کہی گئی نظم میں اچانک بارہ دری آتی ہے؛ یعنی نظم کی خالی جگہیں...... لفظ و لفظ کے بیچ کے وقفے بڑھ جاتے ہیں۔ جس طرح بارہ دری عمارت ہے بھی اور نہیں بھی...... ایک طرف وہ بارہ۱۲ دروازوں پر مشتمل دیواری ہے اور اُس کا کوئی مرکزی دروازہ نہیں؛ دوسری طرف اُنھیں بارہ۱۲ دروازوں پر مشتمل ایک عمارت ہے۔ یہی صورت نظم کی اور اندھیرے کی ہے۔ نظم بھی بارہ۱۲ دروازوں (معانی کے تعدد) پر مشتمل ہے' اور اندھیرے میں داخل ہونے کا بھی کوئی ایک دروازہ نہیں؛ یعنی اندھیرے کا کوئی ایک مفہوم یا مصرف نہیں...... نظم میں اندھیرا اگر خاموشی کی علامت ہے تو دوسری طرف وہ شر بھی ہے۔ گولی اور گالی بھی اندھیرے سے متعلق ہیں۔ دیکھنے والی بات یہ بھی ہے کہ شاہین عباس نظموں میں زبان کو آزادانہ طور پر اپنی معنی سازی کی قوت ظاہر کرنے کی

اجازت دیتے ہیں۔ بعض جگہوں پر تو زبان کی یہ آزادی زبان کی خودمختاری میں بدل جاتی ہے اور نظموں کے بعض حصے نظم کے بنیادی مفہوم سے صرف لسانی رشتہ رکھتے ہیں۔ تاہم اسی دوران میں وہ بعض حیرت انگیز مصرعے لکھتے ہیں اور کچھ نادر تمثالیں تراشتے ہیں۔ یہ چند مثالیں دیکھیے:

آدمی منہ بناتا ہے / جیسے گدھا گھاس کھاتا ہے

(منطق منبر اور مجمع)

مجھے وہم سا ہے
کہ یہ جو کتابیں پڑی ہیں مری میز پر
اور ان میں سے یہ دو جو ہیں / ایسے باہم پڑی ہیں کہ زوجین جیسے!

(کتابیں پرھانے زمانے)

بساندھ مچھلی کی / رات رانوں میں تیرتی تھی
برہنہ خطِ سفید کی تنگنائے میں / زرد و سیاہ زوجِ ازل کی بدروح چیرتی تھی

(شب بیداری)

ہم کہ پیوست ہیں شہر کی عورتوں میں / ہمارا الگ سے کوئی قامت انتقامی نہیں
کوئی بھی منطقہ ایسا دنیا نہیں / جس میں ہم اپنی اوباشیوں کا صحیفہ اتاریں

(مخنث)

خاکروب آیا / گلی میں پھر گیا / روز کا یہ فجری ازمنہ فسفہ
خیر ہو اس فلسفی کی / اک مجلد نیند و صفحہ بہ صفحہ
نوچ کر پھینکا ہوا چوراہے میں / دین و دنیاں نظر سے بچ بچا کر
دیکھتا جاتا ہے وہ / نقطے سے نقطہ ملاتا / جملے سے جملہ بناتا
اپنی جھاڑو پھیرتا جاتا ہے وہ

(بیس گرام بال)

اس نوع کے نظمیہ ٹکڑے اُسی وقت لکھے جا سکتے ہیں جب شاعر کا تخیل ممنوعہ اطراف کی سیر میں ہچکچاہٹ محسوس نہ کرتا ہو۔ شاہین عباس کی ان نظموں میں کئی ایسے الفاظ بھی آپ کو ملیں گے جنھیں ہمارے ادب کی شہری اشرافیہ ناشائستہ سمجھتی ہے۔ اُن میں کچھ لفظ جنس سے متعلق ہیں اور کچھ درماندہ طبقوں کی روزمرہ زندگی سے۔ ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ شاہین عباس کی نظم ایک سطح پر اسی جمالیات کی پابندی کرتی محسوس ہوتی ہے جو ادب کی اشرافیہ کو مرغوب ہے: یعنی نیم مابعدالطبیعیاتی دانش ورانہ مسائل کو تاریخ، جغرافیہ، خدا، مذہب، انسان، جرم، نیکی، ابد، ازل، وقت، لاوقت جیسے مجرد الفاظ میں پیش کرنا۔ دوسری طرف اُنھوں نے کئی ایسے کرداروں پر نظمیں لکھی ہیں جو اجلافی طبقے سے تعلق رکھتے، یا اُن کی نمائندگی کرتے ہیں ...... ان کرداری نظموں میں ''کچرے پہ جھگڑے''، ''یک دست حجام''، ''مستری جی گھر نہیں سیدھا''، ''والناس تک''، ''یہ ولیے کا چکر''،

"چوپایوں کا مخروط" اور "میں گرام بال" خاص طور پر قابل ذکر ہیں۔ شاہین عباس نے انھیں لکھتے ہوئے روایتی ترقی پسند شعریات کو پیشِ نظر نہیں رکھا یعنی ان کی خستہ و درماندہ حالت کو پیش کرتے ہوئے اس کے ذمے دار استحصالی نظام کو دو چار صلواتیں نہیں سنائیں اور نہ اُن کی حالت بدلنے کے لیے نعرہ بازی کی ہے۔ اُنھوں نے ان کرداروں پر لکھتے ہوئے ان کی خستگی و درماندگی کو تو پیش کیا ہے، مگر انھیں انسانی صورتِ حال کے طور پر پیش کیا ہے۔ ایک انسان ایک خاص صورتِ حال میں زندگی کا کیسا تجربہ کرتا ہے اور یہ تجربہ دوسروں کی زندگی میں کیا معنی پیدا کرتا ہے ...... ان نظموں کے مطالعے سے ہمیں اس سوال کا جواب ملتا ہے۔ مثلاً نظم "ولیے کا چکر" میں ترکھان ولیے کی صورتِ حال کی ترجمانی بچوں کو جھولے جھلانے کے واقعے کی مدد سے کی گئی ہے۔ کس طرح وہ عربی اونٹوں، جاپانی گاڑیوں، آسمانی ڈراموں میں بچوں کو اٹھنی کرایے کے عوض سیر کراتا تھا ...... شاعر نے یہاں ولیے کے کردار کے ساتھ بچپن کی زندگی کی بازآفرینی بھی کی ہے۔ یوں ولیا ایک درماندہ اہلِ حرفہ تو ہے ہی، بچپن کی دنیا کو جنت بنانے والا کردار بھی ہے۔ ایک طرف نظم میں یہ مصرعے ہیں:

وہ ترکھان ولیا، وہ لکڑ بدن
جسم کی لکڑیوں کو اٹھائے
گلی میں نمودار ہوتا تو سارا محلہ ہی تیار ہوتا

دوسری طرف یہ لائنیں دیکھیے:

یہ ولیا تھا
جو ہم کو سیر و سفر کی ہوا میں
نمود اور اُفق کی سزاوار معراج پر جا کے
جھولے دینے لگا!

یوں اس کردار کی شخصیت کا کوئی ایک رُخ نہیں۔ اگر وہ لکڑیوں پر کام کرتے کرتے خود لکڑی بن چکا ہے اور یہ کام اُس کو معاشی آسودگی کم اور درماندگی زیادہ دیتا ہے، تو دوسری طرف اُس کا عمل، بچوں کی زندگی میں غیر معمولی معنی پیدا کرتا ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ولیے کا کردار اپنے پڑھنے والوں کے ذہن میں ایک غریب ترکھان سے زیادہ معمول کی زندگی کو غیر معمولی بنانے والے دردمند انسان کے طور پر آتا ہے۔ کم و بیش یہی صورت دوسری کرداری نظموں کے ساتھ ہے۔ انھیں اُردو کی چند اچھی کرداری نظموں میں شامل سمجھا جائے گا۔

اُمید ہے اہلِ نظر شاہین عباس کے اس مجموعے کو پذیرائی بخشیں گے اور اس کی خوبیوں کی بنا پر اسے معاصر اُردو نظم کی چند اچھی کتابوں میں شمار کریں گے۔

ڈاکٹر ناصر عباس نیر

فرشتہ پھر نہیں آیا

وہی بس ایک بار آیا تھا اپنے کام پر
اور کام بھی کیا تھا
یہی بُراق بندوں کو خبر نامہ سنانا
نُور کا خاکہ اُڑانا
فرش پر سے مٹّی کے ڈھیلے اُٹھا کر
پھر پٹخ دینا زمیں پر
یُوں نشانہ باز حکموں کو بجا لانا
کہ جیسے نیزہ باز آیا ہو مشقوں سے گزر کر
اس دہانے پر کہ سب سیر و شکار
آساں کیے جائیں!
الف اَحرام ہو یا لام لنگی ہو
یا اَبجد سے کوئی باہر ہو مُونس ستر کا
ــــــ ہمدردِ دونوں شرم گاہوں کا

شکاری کا حرم میں داخلہ دستور کا گُر
کیسا کیسا اثر تھا اُس کی پھُونکنی میں
وُہ دہانے سے گزر آیا تھا اور ہم
ٹھیک اُس کی سیدھ میں پائے گئے تھے
بابِ استقبالیہ پر ٹھیک ٹھہرائے گئے تھے:
آؤ تو صاحب، یہ کن پہلو دراز آبادیوں میں
پُشت پر شہپر سے شُدھ جھلنا جمائے
پنکھی جھلنے آ گئے ہو،
ذرا گردن کے بلکورے اِدھر لاؤ
جہاں ہم ہیں
نظر کی چوری چھپ ہے، یہاں انگنائی میں
گولائی میں دیکھو،
اِدھر گہرائی میں جھانکو
پسینہ زیرِ جاموں پر ہے، اَحراموں پہ کب ہے!
یہ تلووں کی لڑی نعلین کی جوڑی سے
ملوانے چلے ہو
پنجۂ پا دیکھتے ہو؟
ایڑیوں کے اِس گزشت و رفت سے گزرو!

گراؤ مت ہمارے پائے جانے
اور چھپائے جانے کا کچرا

ہم ایسے اَن پڑھوں کے
حاضر و غائب نہیں ہوتے
کہ ہم تشکیک اور تائید کی دو تجربہ گاہیں بنیں
دن بھر جو لٹمس ٹیسٹ کی نور وز نیلی بار
پر ٹپ ٹپ گریں
سُرخی کو چھا کائیں تو سمجھیں تجربہ اچھا رہا
اَیسا نہیں ہوتا
یہ دونوں پرمیٹو باری باری سب کے گھر آؤ
سبھی کو جانتے جاؤ
عباؤں کا یہ گولا یاں نہیں چلتا
نقاب الٹو
ہمارے ساتھ تم پہلو درازی، راست بازی
کے شگوفے چھوڑنے
پھل توڑنے نکلو
خدارا ــــ آؤ، آؤ
زِندہ ہو جاؤ!!

≈

تم بنو شاعِری!

تم پڑھو شاعِری اور مکمل کرو
وہ جو غیبی اِشارے ادھورے رہے
تم جنم دِن روایت کا ہر سال
گھر پر مناتے ہو
بے مطلب و بے غرض تالیاں پیٹتے ہو
یہ کہتے ہو:
وہ آج کا دِن تھا اور چاند کی یہ ہی تاریخ تھی
لوگ اِتنے ہی تھے، جتنے اِس میز کے گرد ہیں
جب جہنم کی، جنت کی پیدائشِ ناگہانی ہوئی
تم وہیں تھے کہ تاریخ نوزائدہ
اپنے گہوارے سے جھولتے جھولتے گر پڑی

اَور تم گود لے کر اُسے، اس طرف آ گئے
اپنا سب چوکا چُولھا الگ کر لیا
تم سُنو شاعری اور سُناؤ ہمیں
نظم کے تخلیے میں
وہ سب اَندرُونے کا تیار ہنگامۂ لا بہ لا
اور وہ نا حرف تخمینۂ ما و ما
یا دِمصرع کا وُہ ملگجی، گیروا
وُہ سنہری سُبھاؤ
وہ سطروں کا سطروں سے ٹکراؤ
دو جسم ملتے ہُوئے
نقطہ وارانہ تنہائی میں نظم کی
تخلیے میں نہایت کی اور لانہایت کی
آواز کیسی ہے ___ تصویر کیسی
سُناؤ، دِکھاؤ
اگر تم کرو شاعری
میرے سکتے کی،
میرے سکوں کی کچھ اصلاح ہو
مَیں گلی میں نکل کر
سکُونت کی اک بلغمیں کھانس بھر جاؤں
سارے محلّے میں
رُخصت پہ دو اِک لطیفے گھڑوں

اور افواہ چھوڑوں کہ میں جا رہا ہوں
کہیں نظمیہ وارداتوں کے اندوہ میں
— اپنے انبوہ میں
تم بنو شاعری
تاکہ خود میں سے نظمیں چُنو،
اور چُنتے رہو!

یہ جُھولا یہاں سے ہٹاؤ!

اُڑا لے نہ جائے' بہا لے نہ جائے
یہ دُو رسیوں کا دوآبہ
ترے باغ و باغیچہ میں جُھولنے والے سُن لیں
دوآبوں کا اَب وہ زمانہ نہیں ہے
کہ جب چاہا بَل دے کے'
اور بَل پہ بَل دے کے
لہروں کی' بہروں کی پینگھیں چڑھا دیں
زمانہ نہیں
دونوں ہاتھوں سے دُو اِنتہائیں پکڑ کر
ہلاروں کی دھاروں پہ چلنا'
بتانا کہ یہ دائیں کا دائرہ
اور وُہ بائیں کا دائرہ
شغل قوسین کا

زور پکڑے ہُوئے ساری شوقینیاں
اَور جوبن پہ جوبن، یہ غُل اور یہ کُل
سب اِسی قوس کے دو ڈھانوں پہ ہیں
اَب زمانہ نہیں،
اَب زمانہ ترے سبزۂ شرق پر
تازہ معزول پُشتیں ٹکانے کا ہے
سب سَروں سے ہنڈولا ہٹانے کا ہے
آؤ ننگ کی اداکاری،
پلنگ کی نقلیں، بہت ہو چکیں
اصل کی سِل پہ اَب پیٹھ ٹِک جائے تو
بات آگے بڑھے، وقت آگے چلے
جیب میں سے نکالے ہر اِک سَیر بیں
روزی روٹی سے پھُولی ہُوئی پوٹلی
پوٹلی کی گِرہ کھولے،
اور کھانے لگ جائے روٹی پہ روٹی
گِرہ پر گِرہ کھولتا جائے،
کھاتا چلا جائے، اور لقمے لقمے پہ سَر کو ہلائے
نہیں، واقعی اَب زمانہ نہیں
اِنتہاؤں سے لڑنے کو جانا نہیں!

ناخواندہ بھی خواندہ

میں جب بھی نظم لکھنے بیٹھتا ہُوں
اَندھیرے ہی میں لکھتا ہُوں
اَندھیرے میں لکھی نظموں کو لکھنا ہی نہیں پڑتا
سو میرے جیسے، جو لکھ پڑھ نہیں سکتے
اَندھیرا، سب سے اچھی نظم ہے اُن کی
اچانک گفتگو کے غیب میں آغاز ہوتی ہے
کوئی کپڑوں جلا، قرنوں جلا' اَوقات کا کالا
شروعِ نظم سے مصرع بہ مصرع اپنی آوازیں لگاتا
خاص تسبیحوں کو گاتا آتا ہے
اور نظم کے سارے اَبد آباد تک میں گھل سا جاتا ہے
چلو ــــ! گھنگرالے کالے سے یہاں
گالی پہ گالی کون کھائے گا
اِدھر سے گالی چلتی ہے

اُدھر ہر سطرِ استبداد چل پڑتی ہے
ڈو اور ڈو کے جوڑوں میں
اِدھر سے گولی چلتی ہے کہ گالی کس نے دی
اور اُس طرف سطروں کی سطریں،
ٹولیوں میں جھول جاتی ہیں کہ ہم نے دی
ورق کے وسط میں اس نظم کا بھی وسط آیا
درمیاں آیا اندھیرے کا
یہاں پر نظم کو اِک بارہ حرفی آپکڑتی ہے
کوئی بارہ دری ہے جس کا اپنا درمیاں ہے
شروع و خاتمہ کے مشرقوں کے مغربوں کے
اس کے اِتنے مسئلے ہیں
کہ جتنے نظم کے ہیں
مورِخ بات پوری کرنے کی جلدی میں ہے
ابھی کچھ دیر میں،
بس چار چھے چالوں کی دوری پر
مگر اک ایک کر کے بارہ دروازوں پہ
بارہ باتوں کے پردے گرائے گا
اندھیرے کے مکمل ہونے کا اعلان ہوگا
نظم کا انجام ہوگا!

کچرے پہ جھگڑے

مِری دھاک بیٹھی ہُوئی تھی
شریفاں نے اپنے خزانے اُلٹ کر بتایا
یہ اَملاک میری تھی تب
قاعدے کلیے کی کسی رُو سے بھی
اِس علاقے کی پڑتال ہوتی
یہ رقبہ مِرا ہی نکلتا تھا
اللہ میاں کو تو سب یاد ہوگا
اُسی نے تو بھیجا تھا
— جاؤ شریفاں!
یہی اِک کِنارہ بچا ہے
یہ آخرِ اواخر کی آبادیاں

آج کے دِن سے ہم نے تمھیں سونپ دیں
آج سے تم صفائی دُھلائی
کے دھندے میں آزاد ہو!
اُسی نے ادھر ایک عرصہ اِشارہ کیا تھا'
کہا تھا کہ یہ چار دیواری
کچرا ٹھکانے لگانے کو'
ساری کی ساری تمھارے لیے ہے!
تبھی ایک کچرا سی تختی لگا دی گئی
''کچرے والی شریفاں سے ملیے''
مجھے یاد ہے'
اوّل اوّل میں جب ڈھیر کے ڈھیر
لانے کے قابل ہُوئی
تو یہ آبادیاں مجھ سے راضی ہُوئیں
شام ــــ ہر شام'
کچرے سے کچرے کی باتیں جو ہوتیں
تو ساری مِرے حق میں ہوتیں
میں تعریفیں سنتی تو تنگ آ کے کہتی
خدا کے خزانو'
خدارا کبھی مالکن کے مخالف بھی بولو
کبھی تو کہو'
ہم غلط گھر سے نکلے' غلط گھر میں آئے

سراسر غلط جا رہے ہیں
کُھلے کے کُھلے آسماں کے تلے
جانے کس کی کمک، جانے کس کی رسد
کوئی حل ہے نہ حد
پر یہ بولے نہیں مالکن کے خلاف
اور یُوں بوریا بوریا سا بھرم رہ گیا!

شہر بڑھتا گیا
اور بے سُدھ قیامت کی کالونیاں
اپنے اُودھم میں گم، سر اُٹھانے لگیں
دیکھتے دیکھتے
جانے کس کس شریفاں کو گلیوں محلّوں میں
کچرا ابھرے، مجھ سے بھی تیز
پھیرے لگانے کا فن آ گیا
کچرا تختی کا سرنامہ بدلا گیا
''کچرے والی کسی بھی شریفاں سے ملیے''
یہ ملنا تھا اور میرے کچرے میں
ہر ہر شریفاں کا کچرا بھی ملنے لگا
جیسے تاریخ کو قطع کرتا ہُوا دُوسرا خطِ تاریخ
تمثیل کو کاٹتی اِک لکیر اور تمثیل کی
جانے اِس کے علاوہ بھی کیا

کون کس کس کے سینے کی سُتھرائی پر
بوجھ ڈھوتا ہُوا صاف ہوتا ہُوا!
سو میرے مخاطب،
کوئی تم سے پُوچھے
کہ یہ ڈھیر، وہ ڈھیر، دوبارہ، سہ بارہ
ٹھیک آسمانوں کو چُھوتا ہُوا
سب سے اُونچا مُنارہ
بھلا کس شریفاں کا ہے
تو قسم تم کو اس سرزمینِ صفا کی
بتانا نہیں کس شریفاں کا ہے!!

مَوت کے ملگجے میں

گلی میں اچانک نکل آئے ہیں
وُہ جو میرے ہیں
اور وُہ جو میرے نہیں
زِندگی مَوت کی یہ کھڑاؤں کی کھڑکھڑ
یہ مٹّی کی درزوں سے
اینٹوں کے رخنوں سے
بہتی ہُوئی بے بہا خلق ــــ خلقِ خُدا
قیام و اَقامت کی دُنیا کے بہروپیے
لانہایت کے اَطراف میں
بھیڑ ہی بھیڑ ہے
میں جو پہلے سے موجود تھا اِس گلی میں

کسی بھی اُفق میں نہیں تھا
قیامت کے حق میں نہیں تھا
مگر کیا کروں
اَب اطاعت کی پوشاک، گو مجھ پہ سجتی نہیں
پھر بھی مَیں ننگِ نظّارہ، بے چارہ
چاروں طرف سے
اسی جلوہ وجا کے، بے جا دباؤ میں ہُوں
یاں مِری دھجیوں کا تماشا ہے
اور حکم ہے
میں تماشے کی رفتار سے
اپنی رفتار کو کم رکھوں، خوش رہوں
نیند کی گولیاں کھاؤں
گھر جا کے سوؤں، مروں
جس بھی کروٹ کی لپٹوں کو چاہوں،
مِٹاؤں، بناؤں
قیامت کے نعرے لگاؤں!

دُو کا دھوکا

طہارت کا قضیہ ___ دُہرا دَجلہ
دُہری تہری ناف کا دُھلکا
میں دُو کُوزوں کو دائیں بائیں
بھر کر بیٹھ جاتا ہُوں
قیامت بازیوں کا گھاگ لپکا ہے
یہ دائیں بائیں کا ٹپکا
میں دُو چھینٹوں کا اِک چھینٹا بناتا ہُوں
قیامت اور قیامت کے تناسب سے
یہ چھینٹا مجھ پہ پڑتا ہے
تو خانہ دار، اُدھر اُس پار
تم بھی بھیگ جاتے ہو!
درازی لہر کی ہو' قہر کی ہو
ہونٹ سے پھر ہونٹ جا چِپکا

اِدھر آدھا اُبال آدھا اُدھر
حلقوم میں حلقوم کا دھارا، دو دھارا
سارا جا دھڑکا
غٹا غٹ گُھونٹ ــــ بِھرے گُھونٹ
سارے تزکیے کا جُھوٹ سچ
اُتھلا اتھل، تھل تھل
جنم جل کی نمیں ڈھارس رہی
چھاگل صفا چھاگل، رِیا گا گریہ جل
زانُو بہ زانُو اوندھے مُنہ دیکھوں
تو پیندے میں سبھی مائع نظر آتا ہے
قرنوں کے وُہی ہتھ چُھوٹ
ہلکورے کٹوروں میں
وُہی دُو چور، چوروں میں
عمُودی جھالریں پانی کی جیسے
بِھڑ گئی ہوں اپنی عُریانی کے بَل پر
بہتے بہتے،
رہتے رہتے ساتھ اِک چھت کے تلے
افسوس یہ رہتل ــــ!

تب اِک چھینٹے کو، دُو چھینٹوں میں
پِھر سے بانٹ دیتا ہُوں

یہ سیدھے ہاتھ سیدھی آنکھ کا برتن
یہ اُلٹے ہاتھ اُلٹی آنکھ کا برتن
یہ خانہ زاد کا نشہ
وہ خانہ دار کا اُس پار کا نشہ
بغل میں داب کر
ہر دُو طرف کی رمز و رغبت
دھاری دھاری بُو پسینہ
اَز مدینہ تا مدینہ
پھر تمھاری سمت میں سرپٹ
کہاں مَیں اور کہاں رفتار کا نشہ!!

نظم میں خالی جگہیں

نہیں،
ہم نہیں بھر سکے ہیں شکم
شاعری کی قسم
شاعری کا شکم!
ہم نہیں کر سکے حرف اور حرف کو
خطِ مابین کے ماسوا سے بہم
نظم کو ہم خدا سے ملانے چلے
اپنے ڈھب کی تجلّی میں
مصرع اُٹھاتے ہوئے
اپنی دَھج کے یہ سکتے، یہ جھٹکے
نگارندہ متن و معانی کے
مٹی کے، پانی کے سب حاشیے
حلق سے تا ورق

سالمیت کہ ساقطِ اَدا

کُن کا رُکنِ فنا

آدمی کی قسم' آدمی کا یہ موجود

اور آدمی کے خُدا کا عدم

خالی خالی سا موجود ہے

خالی خالی عدم

یہ شکم ہے کہ بھرتا نہیں

ہم بھرائی پہ ماموُر مزدور شاعر

سخن بھر کے لاتے رہے

کائناتوں کی چھلنی کو اوندھا کیے

سر کو نیوڑھائے'

آنکھوں کو موندے ہُوئے

تیرے رَوندے ہُوئے

یہ سرہانے دھرا — مشربِ مُنتہا

کچھ پیا کچھ اُنڈیلا تو سمجھے

کہ نشہ مکمل ہُوا

سطر خیرات کی نظم میں آگئی

سطر خیرات کی

مستیاں لے اُڑیں ایڑیوں کے نشاں

پنجۂ نابلد کی دُرستی میں کیا ماس'

کیا ہڈّیاں

کتنے کردار تھے

سارے کرداروں سے استفادہ کیا

ہم کہ ماخوذ متنوں کو محفوظ کرنے

کی حالت میں تھے

غزوہ غزوہ ہوا کے دباؤ پہ

غائب نوا کے بہاؤ میں آئے ہُوئے

پیش و پس کی عبارت میں لڑتے ہوئے

حرف اور حرف کے درمیانی خلاؤں

میں مارے گئے

شعر کا ایک اپنا حرم تھا

حرم کیا تھا، چوکور چوکی تھی

چوکی کے اس رُخ پہ کیا جانے، کیا ہو گیا

نظم کا ایک اپنا خدا تھا،

فنا ہو گیا!

نظم ننگی ہو رہی ہے

اِنتہائی تجربہ تھا بَین بَین
ابتدا ہوتی تھی دروازے سے اور دہلیز سے
انگنائی سے، انگار کی
چَوپائی سے اِک باڑ کی اِک کھاٹ کی
رُسوائی سے بابِ دُوم، بابِ سِوم کی،
چَو چہارم، پانچ پنجم اور آگے، اور آگے
شِش بیانی ہفت سامانی کے طَور اَطوار کی
اِس ہشت پہلو آدمی کی
بان کی اَندھی پکڑ میں،
شرق سے تا غرب لیٹا
ٹیپ کا مصرع

کہ جیسے کیلیں ہوں ٹھونکی ہوئی

روزمرّہ، استعارہ اور علامت

بھونکتے تھے پاس پاس

نظم کے غُل میں بہ نظمِ کُل بڑی ترتیب سے

بُھوک تھی اور پیاس تھی اور چھوٹ تھی

کچھ شکم سیری کے کرتب

آدمی اور نظم دونوں کو برابر یاد تھے

کھاٹ سے قرطاس تک

قرطاس سے پھر کھاٹ تک

پیراہن و پیرایہ کو ابلاغ کی بس

جیسے تیسے ڈھیل تھی

انجام کے آثار ایسے کم اور ایسے گُم

کہ ختمِ نظم کی جلدی رہی

چادر کو سرکایا سرھانے تک، دِکھایا پائنتی پایہ

ادھر سر کو سرھانے سے ملایا، کیا بنایا

کوئی چالو اختتام اُمنڈا ہُوا نوکِ قلم پر

کون شاعر روکتا

نظم کا اور نیند کا یہ تجربہ اچھا رہا

اندوہ کا اندوہ تھا، اور تجربے کا تجربہ!

منطق، منبر اَور مجمع

آدمی مُنہ بناتا ہے
جیسے گدھا گھاس کھاتا ہے
دونوں میں مُنہ کا بنانا'
نوالہ چبانا'
غٹا غٹ پیے جانا دِن بھر میں
پانی بھری بالٹی
بالٹی میں ہنگالی پھر اک بالٹی
رہنمائی کے چالک
رَسد سے بھری گدلی نسواری کاٹھی
سواری کی دُھن
گارا تعمیر کا، نعرہ تکبیر کا
اوِر رِسالت کا
کتنی ہی قدریں ہیں جو مشترک ہیَں

اِلف اُلٹا لکھیں یا سیدھا لکھیں
یہ الف ہی رہے گا!
میاں جی، سنا آپ نے؟
قبلہ شاہ صاب، دیکھا؟
مرے پنجۂ دست پر ایستادہ
کھڑی کی کھڑی اُنگلیاں، تیرتی ڈوبتی
سب الف کے مماثل الف
منہ کا حاصل الف!
ہاں تو کیا کرتا ہے آدمی؟
مجھ کو منبر کے تینوں دھڑوں کی قسم
منہ بناتا ہے،
منہ پر بناتا ہے پھر کائناتوں کے نقشے
جبیں پر ستارہ
بھنووں بیچ بچّہ جمورا ـــــ
تمدّن میں آدھا، تمسخر میں پُورا
چپت دونوں گالوں پہ موجود کی اور عدم کی
برابر برابر
کہیں ایک ٹھوڑی دِکھاتا ہے چلمن کے پیچھے
مُنڈیروں پہ رکھّی ہوئی سال ہا سال تک ـــــ
منتظِر منتظِر،
اور گدھا بھی یہی کچھ تو کرتا ہے

بزنس کے چکر میں
اپنی شباہت کا چابک گھماتا ہے
اور پھیل جاتا ہے
منڈی کی منڈی میں تیزی سے
جیسے الف میں حمائل الف
جیسے یہ اُنگلیاں اور یہ گھونسا مرا
یہ رہا میرا گھونسا
دولتی مری وُہ اُدھر جا پڑی
آپ لوگوں کی پُشتوں پہ
پنڈال کے اُس طرف!

پھر مہینے کے کچھ خاص ایّام میں
جب گدھا چرنے جاتا نہیں، تو
یہی آدمی گھر میں بیٹھا ہُوا
کیا سے کیا بڑبڑاتا ہے
کیا پیتا کھاتا ہے
کچھ بھی ہو
زندہ تو رہتا ہے، مرتا نہیں
آدمی بھی، گدھا بھی!!

سیڑھی نمبر دو سو بیالیس ۲۴۲

ملاقات رکھو،
کسی ملگجے کے حجابات میں
جشنِ حاجات رکھو وہیں پر
جہاں روشنی کم ہے اور زندگی ہے زیادہ
مُنارے کا دو سَو بیالیسواں پائِداں
چڑھائی، چڑھائی، چڑھائی
اکٹھے کئی سَو پہر کی کسی دوپہر میں
پسینے کے ہم ذات جھرنے
جبینوں سے، بغلوں سے
کُولھوں سے، رانوں سے جھانکیں
تو دو سَو بیالیس ۲۴۲ پر دَم نکالیں

وہیں اپنی پشتیں جما لیں
سمجھ لیں بہاؤ مکمل ہُوا
فرض کر لیں کہ اَب نیچے اُوپر کوئی بھی نہیں
کوئی تاریخ ہے اور نہ جغرافیہ
کوئی تمثیل تلووں سے تسموں سے
باندھی ہُوئی
کوئی تاویل ٹانکی ہُوئی سر کے بالوں میں
اور مانگ پھُنکارتی
کوئی، کچھ بھی نہیں، فرض کر لیں
فقط ایک میں ایک تم ہو
جو راوی سے پہلے،
روایت سے پہلے کا دھن ہیں!
قدم تا قدم پائدانوں کے جوکر ہمیں ہم
اچھلتے ہُوئے، آگے پیچھے
بدن سے بدن کھٹکھٹاتے ہُوئے
تھپتھپاتے ہوئے چوکھٹے چاروں کاندھوں کے
یک دم اسی ایک سیڑھی پہ آ کر رکے تھے
تو چور اپنی چوری پہ ہنسنے لگے تھے
کراہت کراہت سے باہم ملائی تھی
اکائی حرفِ غلط کی طرح سے مٹا دی تھی
نیت سے نیت کی گرہیں کسی تھیں

اور اُن پانچ کپڑوں کو
تین اور دو کفنیوں کو
برابر میں لہرا دیا تھا، نہ جانے کہاں
بُرجیوں سے پرے، چلمنوں کے اُدھر
اور اِدھر
کوئی اُترائی تھی اور نہ اُونچائی تھی
دوپہر تھی مُساوی مُساوی
یہ دو سو بیالیسویں
سیڑھی تھی حاوی!

اور اَب جب
ایجنڈا ملاقات کا آچکا ہے
کبھی تو، کہیں تو ملاقات رکھو!!

وہ سب کیا تھا!

وہ اِنسانی دراندازی کا کوئی تجربہ تھا
زمیں کی ناف پر گھستے ہوئے سات آسماں آخر
پرت اندر پرت اُڑنے لگے تھے
حرم نیکی بدی کے نیلگوں سے لد گئے تھے
خاکدانی بازی گر،
خیمہ بہ خیمہ صف بہ صف
جرعہ بہ جرعہ ہم بہ ہم
ایسے اُمنڈ آئے کہ جیسے پہلے سے موجود ہوں
بس آسماں ہٹنے سے اِن کا قد نکل آیا ہو
بالشتوں سے بالشتیں ملیں تو ناپ میں
پوری کی پوری خلق نامی بِھیڑ تھی
قد کاٹھ میں پکّی

میں پہلی بار جب تم سے مِلا
تو چاکِ عُریانی سے تا چاکِ قبا پھیلاؤ تھا میرا
تمھیں جیسے برہنہ حالی میں ہم زاد مِل جائے
یہ کام آسان تھوڑی تھا
ہزاروں شرم گاہوں کا پھلانگا
سترا اندر ستر دوڑائے
نواحِ ناف میں نایافت کی گرہیں لگائیں
مُہریں گہری کیں برائے مرتبہ ننگی اطاعت کی
خلافِ واقعہ شہوت کو حسبِ واقعہ لکھا
تماشا مُو بہ مُو ہر رال سے ٹپکا
میں ہر طرفین کو لپکا
یہ حجلہ بُوند بُوند انسان سے بھرتا گیا بھرتا گیا
تب تم ملے اور مل کے عُریانی مکمل کی
ازل کے خطِ ممنوعہ پہ بیٹھے غُرفے میں
اِک دوسرے کے کش لیے
اِک دوسرے کا سم پیا
جرعہ بہ جرعہ، لب بہ لب
جرعہ بہ جرعہ، لب بہ لب مرنے چلے
مرتے گئے، مرتے گئے!

یہی نظم باقی بچی ہے!

تم نے ماچس بنائی
مرے ہاتھ آئی
میں تیلی جلا کر گھمانے چلا!
خالی چکّر میں شعلے کو،
اور شعلگی آزمانے چلا!
مرکزہ دائرے کا کہاں تھا
وہ اِک حیلہ باز آگ کا حیلہ گر
جانے کس آنکھ کا تِل تھا
جو وسط نے بستگی میں ہی مارا گیا
مرکز آرا گیا!
میں بڑھتا گیا دائرے کا محیط
آگ کے بھاگ جاگے، میں سویا رہا
نار کے گہرے نارنجی باغات میں

نور کی نیلی پرچھائیں سے مُنہ کا پردہ کیے
شرع کا دَرد بس جیسے مجھ کو ہی تھا
میں نے ڈاڑھی نکالی، عمامہ اُچھالا
عصا کا عمُود اِس زمیں پر گرایا
سما اپنے کاندھوں پہ ڈالا
بہت روز ایندھن نے یاری نبھائی
نگوں ہوتے دیکھا جو لَو کو کسی دِن
تو گھبرا کے میں نے دِیے کا سہارا لیا
آگ، بتّی کو پکڑا دی اور خوش ہُوا
روشنی میری دانست میں مستقل ہو گئی
تم نے ماچس بنائی، مِرے ہاتھ آئی
میں نظموں کے اَنبوہ میں
شاعرِ آتشیں سَر کا بہروپ بھر کر
بیاضوں پہ اُودھم مچاتی اُچھل کود کرتی
چمتکارِ چنگاریاں گن رہا تھا
کہ جو کاسہء سَر سے
نظموں کی آزادیوں، ہفت آبادیوں پر برسنے لگی تھیں
چھما چھم مچا مچ، یہ مچ مچ
یہ بے قابو جھوٹ اور سرپٹ سیہ سچ
جبھی میں نے جانی تمھاری رضا
پھر سے اِک بار یُوں ہی، یونہی

تم کہاں چاہتے تھے کہ نظموں سے ثابت ہو
میرا تمھارا تعلق ـــــ یہ فتنہ فتیلا
کہ ہم کون سی حالتوں میں ملے
کس سنگھاسن کھُلے اَور کتنا کھلے

میں نے پردے کا بَرکاٹ کھایا
لبالب دیے کو زمیں رُخ لُنڈھایا
ورق تا ورق آگ بھڑکی
سخن تا سخن نظمیں جلنے لگیں
اَور دُو طرفہ اِسقاط ہونے لگا
پھر جب اِسقاط پُورا ہُوا تو میں اُٹھا تم اُٹھے
اَور پھر خالی چکّر میں خود کو گھمانے لگے
آگ ماضی ہُوئی، راکھ راضی ہُوئی
ساری نظموں کے خاکستر و خاک پر
اَب یہی نظم باقی بچی ہے
جسے سالہا سال سے لکھ رہا ہُوں!

خُدا،
تم نے ماچس بنائی
جو میرے تمھارے بہت کام آئی!!

اُس تیسرے کا روگ

جُلوس، دُو کے درمیاں
جلوس ___ ماتمی جلوس!

ایک تو اَزل اَبد ہیں دُو
کہ جب کبھی بھی محرمانہ سرکشی میں
ایک دُوسرے کو آنکھ مار کر
کھنک اُتار کر دہن میں سہو کی
ذرا جو کاج کَف کی بے حِسی پہ ہاتھ جا پڑا
بٹن اِدھر اُدھر ہُوئے
گلے کو کاٹتی ہُوئی زِپیں
نشانِ لانشان سے سرک گئیں
تو بے لحاظ اِک ہُجُوم اُمنڈ پڑا:

نہیں، ابھی سے نہیں
یہ بیچ بیچ کے بگل
یہ درمیاں کا جَل، یہ تھل
سمے کا دیر یاب پَل
ہم آ گئے
برات روک لو یہیں
سہاگ اور شگن کہ بدشگونیاں ہیں
صحبتیں حرام ہیں
چوبارے والیاں اُدھر
چوراہے والے سب ادھر
پڑے رہیں، ڈرے رہیں!

پھر ایک دو تو وہ بھی ہیں
جو رات دِن کے نام سے پکڑ لیے گئے تھے
کام پر گئے ہُوئے
سپاہی نے کہا کہ چور ہیں، یہ چور ہیں
دبے دبے نکلتے ہیں قرائنوں قرائنوں
زمانے میں الگ ہی چال ڈھال کے ہیں دو
یہ اِک سیاہ، اِک سُفید حاشیہ
گزر بسر کے چوکھٹے الٹ پلٹ کیے
اور اپنی راہ لی

نہیں ابھی سے نہیں
کہ گھونگھٹے کی ڈھال میں شگاف ہو
نظر اٹھے دلھن کی اور نوشہ ہم لحاف ہو!

تب ایک دور آئے گا
کہ آخری جرأت کی نیتیں کیے ہوئے
جبیں کے رخ جبیں کیے
رکوعی بولیوں کی دھن میں
مہندی والے گیت گاتے، اِس طرف
ہم اور تم بھی آئیں گے
کدھر سے آئیں گے، ابھی پتا نہیں
مگر وہ تیسرا بھی ہوگا ساتھ ساتھ
درمیانِ نادرست کا درست درمیاں
زمیں کا آسمان یا کہ آسمان کی زمیں
ہم اور تم رواں رہیں گے آسماں کا سہرا گاتے
دف بجاتے سینۂ سوال کی
کبھی تو اِس کے جوڑ کی دلھن بیاہ لائیں گے
ہم اور تم جب آئیں گے
کب آئیں گے!!

خبر کو سُونگھتے پھرتے ہیں بیچارے

یہ سیّارہ ہمارا
بند رہتے رہتے بالکل بجھ گیا ہے
عجب بے ڈھب زمینی تخلیہ!
خاکستری سی اُونچ نیچ اور یہ اَراضی
اَیسا قطعِ آتش و آہن!
ملازم پیشہ تھے، بیکار پھرتے ہیں
وصول ایندھن ہُوا ہوتا تو ہم بھرتے
یہ جدوَل بھی
رسیدیں کاٹتے ڈیزل کی نگرانی پہ بیٹھے
آگ کی بنیاد رکھتے
غم زدہ فرنس کی کچھ ڈھارس بندھاتے
آگ کے ساتھ آگ بن جاتے
کنارہ کش، اُداس اسٹیم کو مٹھی میں بھینچے

گھماؤ تاؤ سے بجلی بناتے
نظر سکرین پر اور اُنگلیاں ''کی بورڈ'' پر ہوتیں
ورق پر جس جگہ قرأت رُکی ہوتی
وہیں سے چلنے لگتی
جہاں جس ثانیے میں رحل نے بازو سمیٹے تھے
وہیں سے کھلنے لگتے
روایت کی کٹوتی پر
رواجوں کے خلل پر گفتگو ہوتی
اَبد پر روشنی پڑتی
مگر وہ شعلہ چنگاری کا سمبندھ
آتشیں یاری، دھوئیں کی گندمی دھاری
زمیں سے آسماں تک، اَب کہاں ہے
آگ کو ہم یاد بھی آتے نہیں کیا
کئی عشروں سے اِس وردی کی
دو جیبوں میں زندہ ہیں
یہ وردی ـــــ جسم پر چپکا ہُوا
خاکی خیالی نیلا پیلا جسم ہے
اِسے ہم راکھ کی لا اِنتہا کے رُوبرُو
کیسے اُتاریں !!

قبل اَز قبل

مجھے اُن دِنوں مُو بہ مُو ہوش تھا
جن دِنوں بات بے بات کی
ہر سیاہی سُفیدی کے معلوم میں
سانولے پَن کے دَورے پڑا کرتے تھے
پَے بہ پَے خالِ خالِ فراموش پر
اور میں گِر جایا کرتا تھا سانول کے اَندھیر میں
رنگ کے ڈھیر میں
روشنی بِن بُلائے لپکتی تھی میری طرف
نبض کو ہاتھ میں لے کے حیران ہوتی تھی،
کہتی تھی: ایسے مریض اَب کہاں،
ملگجے کا مرض ــــ مستیوں کے معلّق دُخاں،

اَرض کے تجربے میں نیا آدمی اور نیا آسماں؛
شخصِ ناشخص کا جاں گُسل جھٹپٹا ___ خوں بہا!
دَورے پڑتے رہے اور میں گِرتا رہا
مجھے اُن دِنوں
میں من و تُو سے آمیز تھا جن دِنوں
سانولے پَن کے چکّر چڑھا کرتے تھے
ضربتیں عام تھیں؛
میرے زنگال کی گردشیں خاص تھیں
اور میں بھَر جایا کرتا تھا جُھولوں ہنڈولوں
کے پھیروں سے
سا جن نُما گھیر تھا، کیسا اَندھیر تھا!
آج دِن بھر کا معمول یُوں ہے
تو کیوں ہے
الِف الگنی ___ الگنی پر یہ انگ انگ جھرمٹ
قمیص اَور سلوٹ
یہ میں اَور تم
اور یہ جھونکا، یہ جُھولا، ہنڈولا
ذرا رُوز مرّہ کی وادی میں
سیرابی کی مشق جرعہ بہ جرعہ
کِنارے کِنارے تمھارے اُلانگ اور
پَھلانگ ادِر اُدھم

میرے کونین کا کا لیا'
تھوڑا تیز اَور تھوڑا سا مدھم!
میرے مُنہ کی ہر رال کا'
میری تسبیحِ اعمال کا ہے جنم
آج کی شام سے کیا حیا
آج کی رات کیسا حرم' نا حرم
ہاں تو میں کہہ رہا تھا
میں بھٹکتا رہا' چکّر آتے رہے
سانولے پن کے جھٹکے لگا کرتے تھے
اور میں مر جایا کرتا تھا ہیں اُن دِنوں
موت کا جب تعارف مکمل نہیں تھا
میں اوّل سے اوّل تھا ہسب رنگ نامی
اِدھر کا مہاجر' اُدھر کا مقامی!!

کتابیں، سرہانے، زمانے

مجھے وہم سا ہے
کہ یہ جو کتابیں پڑی ہیں مری میز پر
اور ان میں سے یہ دو جو ہیں
ایسے باہم پڑی ہیں کہ زوجین جیسے!
مسہری پہ یہ جو سرہانے ہیں دو
ایک نیچے ہے اور ایک اوپر
مجھے شک ہے، یہ بھی کسی ازدواجی
مناسک کی توسیع ہے
اگر ازدواجی نہیں تو کم از کم
کسی سہوِ شہوت کا عنوان ہیں
یعنی دو دو کو یوں حالِ ممنوع میں

ایسے آئین کا درپیش ہونا
کہ جب تیسرا کوئی کمرے میں بیٹھا ہو
اپنی کن انکھیوں کا قبلہ گھماتا ہو'
بے شرم ہو کر
بھرم کی نہیں شرم کی بات ہے
شائبوں کی عجب پھانس ہے
نوکِ پا سے جو چلتی ہے
ہونٹوں پہ اپنے زباں پھیرتی
ٹخنوں ٹخنوں میں تڑ تڑ تڑا ز و
کہ جیسے دھمک ہی دھمک
جیسے بغلوں میں دابی ہوئی سنسنی
حلق میں لقمہ لقمہ معلّق غذا
— لانہایت کی غایت غذا
یہ پکڑ سر تک آتی ہے
اور پھیل جاتی ہے
بالوں کے دو رنگی اندھیر میں
سر سے اُوپر خُدا — وہم کی ابتدا'
وہم کی انتہا
میں نہیں چاہتا
دو کتابیں ہوں یا دو سرہانے ہوں
میں اِس ملن میں مخل ہوں کسی بھی طرح

تب میں کمرے سے باہر زمانے کی دہلیز پر
گھوم جاتا ہوں سر دھڑ کے مافوق میں
یہ زمانے کے اُوپر زمانہ لدا
زیر جاموں کی وِدوا آتشہ شاعری
انفرادی نہیں اجتماعی زنا
کون گنتا پھرے اب
کتابیں سرہانے 'زمانے' خُدا!

تاریخ بھی جُغرافیہ بھی

عوام الناس کو تاریخ سمجھاتے ہیں، آؤ
وَرق گردانی سے اَب کچھ نہیں ہوگا
وَرق گردانی سے تو لحن بھی جاری نہیں ہوتا
تمھیں تہذیب جاری کرنے کا دھوکا ہُوا ہے
مناروں کی کمندیں،
بُرجیوں کی حکم دارانہ زقندیں
حاضِر و غائب کے نقشے صف شکن حُجرے
اَزل اَندر اَزل کاری گری کا سَم
کوئی اسٹیج ہے کیا؟
اَبد اَندر اَبد تم نے نگارندوں کو چھوڑا ہے
یہ اصلِ ماجرا کی منہ دِکھائی ہے

کتابی چلمنوں کی پھُونک تھوڑی ہے
سُنوُ نادید کی قرأت ہے یہ تکبیر کی جلوت ہے
کوئی نقطہ نقطہ جھونک ہے
ان جالیوں سے جالیوں کی طرح چمٹی ہے
یہاں کے گنبدوں کو گنبدوں کی طرح کھاتی ہے
زمانہ جا چکا تاریخ کو تاریخ کہنے کا
روایت کو بڑی سکرین پر فلما کے جتنی
کامیابی فلم والوں کو ملی ہے
راویوں کو کب ملی تھی!
گرھستی چل پڑے تو کوئی ترغیبوں
کے پلڑے میں پڑا
مُٹھی کے ڈالر چھوڑتا ہے کیا؟
یونہی برتا گیا انسان کو منڈی کی تیزی میں
سٹاک ایکسچینج کے مصنوعی اُودھم میں
کہانی مار دی ہم نے
کہانی کی جگہ خالی جگہ ہے
اور یہ خالی جگہ ـــــ
جانے والوں کے لیے جُغرافیہ ہے
آنے والوں کے لیے تاریخ ہے!!

ہم نے عالَم کو بہت بور کیا

بات ہی ایسی تھی ہم دونوں میں
بات سے جس کو بڑھایا نہیں جا سکتا تھا
صبح کے سات بجے سے چل کر
رات کے گیارہ بجے تک پہنچے
اور پھر نیند میں بھی چل سو چل، چل سو چل
سرتا پا دھکم پیل
عالمین اپنی بنت کی باری ہم سے
لیتے رہے باری باری
ڈور کے لچھے چڑھائے ہوئے بالشتوں پر
تار کے گولے گھماتے ہوئے
انگشتوں کے دس نمبروں پر
کاتنا سوت کی صورت ہیرت
اَنت سے پھسلی ہوئی پوروں پر

کچھ دباؤ بھی تو بے اَنت کا تھا
رنگ کچے تھے، رگ وپے میں گھلے
گھُلتے رہے
دھاگا بندھن میں جو ہم دو تھے، کھلے
کھُلتے رہے
ڈوریا، ڈوریا، تھم ــــ خاکیا، خاکیا، رُک!
جانے دونوں میں سے آواز پڑی تھی کس کو
ہم نے یہ صوتی تکیل آڑے نہیں آنے دی
زِندگی دونوں سروں پر کھڑے ہو کر دیکھی
رُخ کیا قبلہ گہِ شرق کو بھی، جلوہ گہِ غرب کو بھی
جال ہی جال بس اوڑھائے ان آبادیوں کو
اور سرکتے گئے ہم، رکھتے گئے پاؤں پہ پاؤں
اِک چھناکے کا ہُوا تجربہ لہروں لہروں
لہریا، بندہ بشر ــــ کون مگر، کون بشر!
بندہ بشر، بندہ بشر، بندہ بشر
گلیوں گلیوں کا یہ گنجان تموّج برتا
گھر کو پلٹے
کھاٹ کو کھونٹی سے کھول کے چھت پر بِچھا
نیند کی باری تھی، نیند آنے لگی!!

متروکہ و ممنوعہ

میں نے گمنامی میں مَرنا چاہا
اَور چاہا کہ مِرے مَرتے وقت
دائیں بائیں کے یہ دُو ہاتھ
مجھے حلقہ کیے
گھیرے میں لے لیں چُپ چاپ
اُلٹے سیدھے کفِ پا
تلووں کی چھال سے لپٹائے ہوئے
گھستا رہوں
اوراچانک مجھے مَرنا پڑ جائے
تسمیہ اَور تعوّذ کے بغیر
چشمِ بے پردہ کی فحاشیِ کم مایہ کو
اگلے وقتوں سی کہاں شُہرۂ نابُود کی تاب

چلتے چلتے کہیں اوباش جلوسوں
کی معیت میں مجھے
میری کہنی کا ٹھوکا مجھے آلے اور میں
اپنے چوگرد سے غائب ہو جاؤں
نوجواں بوڑھے کے
ناکردہ سکینڈل کی طرح ہاتھ نہ آؤں
میں نے چاہا کہ مجھے
نیک نامی کی سند
گوشۂ گمنامی ہی میں ملتی رہے
یہ مرا گوشۂ گمنامی، مشارق نامی
میرے سیپارۂ تسطیر و تماثیل کے سر پر
کوئی چھت، کوئی حجرہ کوئی اسٹیج نہیں
ایسا اسٹیج کہ چوپایے ستادہ ہوں
تو معلوم کی مقسوم کی دھوم
دست و بازو سے مچاؤں،
جشن مناؤں
سینہ بر سینہ قدم تا بہ قدم
اڑتے، اچھلتے ہوئے میں
حجرے کی چھت سے لگ جاؤں
لگ تو جاؤں گا مگر
فائدہ ایسی اداکاری کا۔۔۔

فائدہ ثانیہ تا ثانیہ
تاریخ کی اس حاشیہ برداری کا؟
میں نے چاہا کہ مرے سامنے
اِک اِک کر کے
سارے اِعراب اور اَعداد
اُٹھا لے جائیں
جب سماوات اِدھر کو آئیں
حرف کے ترکہ، متروکہ و ممنوعہ سے
لڑتے لڑتے
نام کے عین نشانے پہ
مجھے رات آ جائے
نرغۂ شرم میں
بے حالت و بے کیف پڑا سویا رہوں
میری یہ اوڑھنی اور میرا لحاف
چادرِ ہفت کناری کے شگاف
مجھ کو جگاتے رہ جائیں
میں نے چاہا مرے اندوہ کی رفتار میں
رخنہ نہ پڑے
مجھے مرنا نہ پڑے!

لُغَت لُغَت جِرَح

لُغَت کے اِختیار پر جِرَح کرو
ہمیں جو گالیاں پڑی ہیں
اُن کا ترجمہ کسی زمینی' آسمانی
کاغذی' خُدائی ناخُدائی کی
زُبور میں نہیں مِلا
قصائصِ اَلَست ورِحل رُو وحال مَست نے
جِھڑک دیا ہمیں کہ بھائی،
جاؤ اَپنی راہ لو!
تمھارا ملک تو وَرائے رَزمیہ
اِک اِبتلائے رزم کا فریق ہے'
مریض ہے

تمھارے ہاں جو گالیوں کا لین دین ہے
ہمارے زیر اور زبر کی تاک جھانک
سے مِلا نہیں
تمھیں ترازوؤں کی بد دُعا رہی
سو ہم نے اپنی رُوز مرّہ گفتگو میں
بد دُعائی خلق سے کلام ترک کر دیا
عرب عجم کے درمیاں محاورہ بدر کیا
تمھیں تمھارے شرق و غرب سے بھی خالی کر دیا
یہ گالی خور سلطنت، یہ ہم
ہزار خواندگی کی گھن گرج میں گُونج لیں
اِدھر اُدھر سے گالیاں جو کھائیں گے
— زبانِ غیر میں
تو گالیوں کا ترجمہ خُدا ہی سے کرائیں گے
کہ متن، درمیانِ متن کیسی مار دھاڑ ہے
دھرم ہے یا دھرم کی چھیڑ چھاڑ ہے
فساد فی البلاد کی شکایتیں
لُغت نہیں سُنے گی یہ تو کس کو جا سُنائیں گے
حرام زاد خواندگی کو مَوت آئے
مَوت کو بھی مَوت آئے
کھا گئی یہ خواندگی
وَرق وَرق کی گفتگو

بغیرِ ترجمان و ترجمہ لہُو

—— لہُو لہُو

سُنو تو جمع نفی کے مقررو،

نِدا نِدا کے درمیاں

زبانوں سے زبانیں کھینچنے کا وقت ہے

امانتوں کو سَہج سَہج سینچنے کا وقت ہے

لُغت کے اِختیار پر جرح کرو،

معانی کا خلا بھرو!

تمہید کا لاوا

یہ چولہا جل رہا ہے
اور ہنڈیا پک رہی ہے
تم اِس زحل کی رکھوالی پہ بیٹھی ہو
پُرانی، یا بریدہ بان کی پیڑھی میں دھنس کر
باڑھ میں پھنس کر کلائی کو گھماتی ہو،
ذرا کفگیر کا چکّر چلاتی ہو
تو یہ باورچی خانہ بھاپ کا مرغولہ بن جاتا ہے
اور تم جھولنے لگتی ہو مرغولوں کے جھولے
یہ چمنی نام کا حربہ —
سُرنگ اُبھری ہُوئی، دیوار پر
جب چھت سے باہر سنسناتی ہے
تو اُوپر، اور اُوپر آسماں تک ڈنک جاتا ہے
دھواں دھاروں کا جو اگلا دہانہ ہے

تمھیں پسلی میں پڑتا ہے

جہاں ماچس کی تیلی سُرخ ہے،

سُرخی سکونت ہے

ذرا سا شور یا چکھ کر سمجھ لیتی ہو

اَب کس آنچ کا کیا کھیل ہے

کھانے میں کتنا وقت رہتا ہے

اِدھر میں اَپنے کمرے میں

دہن ٹی وِی کا کھولے

خبر کی اِشتہا سے بے تکلّف ہو رہا ہُوں

پہاڑی منجھ پر بیٹھے

شروعِ نار کے بازی گروں کا

دانہ پانی اُٹھ چکا

اعلان ہوتا ہے:

شروعِ کار کا آتش فِشاں تھا پھٹ گیا

گھر کی خبر رکھیے

میں کھلتا کھولتا باورچی خانے میں پہنچتا ہُوں

جہاں معمول کی بھاپ اُٹھ رہی ہے

ہر طرف مرغولوں سے مرغولے جوڑے جا رہے ہیں

تم کہاں ہو؟

〰

تالیوں کے کھوج میں

مجازی آقا،
مجازی آبادکاریوں کے
معاہدوں میں جُتے ہُوئے ہیں
نئے نئے طالبِ ستائش ہیں
دادخواہوں کے باب میں
ذِکر چاہتے ہیں
سوال یہ تھا:
زمین اِن کی مدد کرے گی؟

دوام پیشہ زمیں کو جب یہ خبر ہُوئی تھی
کہ اِس پہاڑی کے اُس طرف
بڑی بہت ہے

مکالمے کے دھنی
جہازوں میں اُڑ کے جاتے ہیں
اور کاغذ پہ کھینچ لاتے ہیں نقشہ نقشہ
مجاز آباد کا ــــ کہ جس کے گلی محلّوں میں
زندگی، زندگی سے کہتی ہو:
"کیا زمانہ ہے بعدِ انساں کا
اے بہن،
اس برت بھگت کی تباہیوں میں
نہ تو برت میں، نہ میں برت میں
نہ تیرا خرچہ، نہ میرا خرچہ"
بس ایک یاد آدمی کی ہے اِن عمارتوں میں
وہ راضیہ کے توے کی روٹی
جلی کٹی کچھ سنا رہی ہے
زمانہ کایا کلپ ہے پُوجا کا
اور اوندھی پڑی ہے تھالی
وضو کے پانی کا گھونٹ گھونٹ
اِنتظار میں ہے
کہ پلوشہ کے گلے میں کھنکے!
نسائی بیگم کی کُہنیاں چوم کر
یہیں حوض کے قریب اپنی شام کر لے
چھنک چھنا کا چھنن چھنن، چھن

مگر بہن،

اَب نہ تیرا برتا، نہ میرا برتا

ہمیں تو بس وقت کاٹنا ہے!

مجاز کی خانہ داریوں میں،

مجاز کی خانہ زادیاں ہیں

پڑی رہیں گی

اِس الگنی کی دو رویہ دھاروں پہ رات دِن

ڈوبتی ابھرتی کہ جیسے سنگیت جھولتے ہوں

دھمک دھماکا، دھنن دھنن دھن

سُرود سنگت میں پیاری بہنا،

نہ تیرا خرچہ، نہ میرا خرچہ!

دوام پیشہ زمیں نے جب یہ سُنا

تو ہر طالب ستائش کو داد پہنچائی

ایک لمحے میں پیچھے ہٹ کر

ذرا سا اُوپر ہوا میں اُٹھ کر

بلند ہاتھوں سے سرغنہ تالیاں بجائیں

جِلَو میں اپنی جگہ بنائی

پہاڑیوں پر نئے سِرے سے جوانی آئی!!

ہرن مینار کی چوری

یہ ایک ایک کر کے،
سبھی پاگلوں سے یہی کچھ کریں گے
کہیں گے:
کہاں درد ہے اور کیوں درد ہے!
— ایسے ہر خوان پر منہ نہیں مارتے
ہر پیالے کے پانی کو چٹکی میں بھر کر
دراندازِ کیچڑ میں حصہ نہیں ڈالتے
شعبدہ بازی برحق ہے
لیکن سرِدست ایسا بھی کیا جبر ہے
تم کہ ثابت کرو نون کا نیلگوں، سین کا سبزگوں
اور لکھنے لگو
اپنی ناخن درازی کے، پنجہ طرازی کے
سب معجزے

معجزوں کی کریہہ القدم آہٹوں سے
کراہت کا شیوہ رکھو اور پھر دیکھو دُنیا
اُدھر شہر کی بُرجیوں میں معطّل کیا ہے
مٹرگشت کو، کرفیو کے دِنوں میں
اور اَب وُہ چھتیں
پھانسی دینے کا اور پھانسی لینے کا
محبُوب زینہ بنے فرش کو چھو رہی ہیں
یہ تاریخ سے بھی وُہی کچھ کریں گے
جو صُومالیہ سے کیا ہے
کہیں گے:
اری لَونڈیا،
تیرے کیا دَرد ہے، اور کہاں دَرد ہے؟
زمانے کے چوَراہوں میں
ہونٹ سے ہونٹ جوڑے
وُہی رس بدل، رال رُو ایک مشہور جوڑی
نظر آئے گی
گُھونٹ پر گُھونٹ لیتی ہُوئی
بے تکلف قرائن میں گُھلتی ہُوئی
بچ بچا کر خدا کی نظر سے نکل جائے گی!

دُوسرے ایکٹ میں

آدمی کا نچوڑ آدمی پر گرے گا
تو برطرزِ انزال،
قومی ذہنوں کے بھگوئے ہوئے روئیں گے
اور اک تھوک پر حاملہ کی وضاحت
سُنی جائے گی:
تیرے گیتوں سے میں حاملہ ہو گئی
شہوتِ ہفت پردہ کے اس ساتویں حِل میں بھی
ایسے اوجھل میں بھی، پیٹ کھلنے لگا!

آخری ایکٹ میں
یہ جہازوں سے روٹی گرائیں گے
بھاری لفافوں میں باندھا ہُوا رِزق
مشّاق، سب بگڑی بپھری ہواؤں کا پیراک
بس بھوک کے وزن پر جھومتا جھولتا
ایسی تیزی سے آئے گا نیچے
وہیں کیچ کر لیں گے ہم
موت اور زندگی
اپنے اپنے زنا سے مکر جائیں گے
سارے پاگل تسلی سے گھر آئیں گے!!

گلی گھومتی ہے

گلے میں پڑا ڈھول ہے
جو بجانا پڑا ہے
ٹھگوں کی یہ آفاقی آبادی
اپنی حکایت میں کب ٹوٹتی ہے!
وُہی جملہ بازوں کا پھندا
وُہی ٹھگنے ٹھگنے سے راوی ہیں
جو نقل کو اَصل کہتے ہیں
بنکوں میں آویزاں گھڑیال جیسے
معیشت کے مہمان اداکار سب
بے حالت وحال جیسے
یونہی سودی قرضوں کے میزانیوں پر
قلم کو گھماتے چلے جارہے ہیں

گلی میں گلی گھومتی ہے
سُنا، گمرہو ۔۔۔ کیسی چاندی ہُوئی
تم زمانے میں نکلے، زمانے سے پھسلے
دوبارہ زمانے میں نکلے ہو جا کر
وُہی دائیں بائیں دِکھاوے کی دولت
نمائش کی پُونجی، غلط کاریوں میں اُڑاتے ہوئے
آزمودہ کرنسی کے کرتب دِکھاتے ہُوئے
بھیڑ میں جیسے کاندھے سے کاندھا بھڑے
پاؤں پر پاؤں آئے یونہی آتے جاتے ہوئے
بدی کو بدی چُومتی ہے
گلی گھُومتی ہے
لبالب غٹا غٹ کراہت کا دورانیہ
بوسہ بازی کا نامختتم ثانیہ
آمنے سامنے کے مکاں دھنس گئے
اس تماشے کے گوریلا گرداب میں
ہر برس، ہر مہینے یونہی گلیوں گلیوں
گلی گھُومتی ہے
علاقے سے عاری صدی میں
صدی گھُومتی ہے!!

قہقہے سے مذاق

وہ قہقہہ قبول کرتے وقت میں بدک گیا
چہار گانٹھ کھونٹی ہزار پیچ کھا گئی
ہنسی گلے سے گر پڑی زمین پر
تو اصطبل کا ہر بلال، ہر حرم
وہیں حرام ہو گیا
منادی ہو گئی کہ اس فرس سے پردہ کیجیے
یہ آپ اپنی کنپٹی کے حاشیوں سے پھر گیا ہے
نتھنیوں سے گر گیا ہے
غیریت کی انتہا سے جا مِلا ہے
محرموں میں اَب نہیں
کسی بھی وقت پائے مجرمانہ کے
چہارمی فساد کو
ہزارویں عناد کو اِدھر اُدھر برت نہ لے!

غلط جگہ، غلط مخالفین پر
ہم ایسے عصر دار، عصر باز
سب کے سب معاصرین پر
یہ اصطبل کا اَہل اَب نہیں رہا
علاقہ ہوشیار،
اپنی ریزہ ریزہ کھلکھلاہٹوں کو جمع کر کے
پھر سے ایک قہقہہ بنائے
اور وہ قہقہہ لگا کے بھی دِکھائے
سارے صاحبانِ قہقہہ کے جلسہ و جلُوس میں
فرس فرس سے داد جو ملے
تو داد ہی میں ممکنہ نجات ہے
وگرنہ یہ تو جرمِ بے برات ہے
مگر یہ میں براءت و نجات کی
نکیل پھر سے ڈال لُوں؟
قبیلے والے خوش نہیں گداز سے گزند سے
ملالِ نعل بند سے، اِسی لیے؟
بدک تو میں گیا ہوں
اور بہانا بھی ہے میرے پاس
نکل نہ لُوں گلی گلی نگر نگر؟
اِدھر مُنادی اُور رُخ پہ چل پڑے
کسی نے دیکھا ہے ہمارا لال

کچھ غمیں سا کچھ اداس سا
ہنسی ہنسی میں جو ہزار ہا برس
کا ساتھ توڑ کر چلا گیا
قریبِ اقتدار تھا
کہ کنپٹی کے حاشیے میں اُس کی باری درج تھی
اُسی کا ہنہنائی دَور آرہا تھا اور وہ چلا گیا
وہ نعل نعل ــــ سلطنت
وہ بال بال ــــ سلطنت
اِدھر مزے مزے سے مَیں سُنوں
وہ ساری سوگواریاں
اور اَپنے حصّے کی بچی کُھچی ہنسی ہنسوں
ترے نثار سلطنت
مَن خلیفہ
س ل ط ن ت
ط ن ت
بدک، بدک
شجَر حجَر، بشَر بشَر
پھلانگتے اُلانگتے
میں تیسرا سفر کروں!

کچھ سڑک کے بارے میں

میں سڑک کو جب بھی دیکھوں
حادثے کے فاصلے سے دیکھتا ہوں
اپنی بینائی کے برتے پر
نہ جانے کیا سے کیا مڈبھیڑ کا
پہیہ گھماتا ہوں!
جو پیدل باریاں لینے نکلتے ہیں
رضا و رزق کی، یا پھر سزا و صدق کی
وہ دو رویہ قطاروں میں لپکتے،
محوِ اطراف و جوانب گھومتی گردن سے
لہراتی لکیریں پیٹتے،
پُشتوں کے مٹکے اوندھے منہ ڈالے ہوئے
ٹخنوں کی دو تختہ کھٹولت پر
ہَوائی جوکروں کے تیز طرارے

چھناکا چھیڑتے،
دونوں طرف ایسے گزرتے ہیں
مجھے لگتا ہے کوئی حادِثہ پھر ہو گیا ہے
اور میں جائے حادِثہ تک
گاڑی دوڑاتا ہوں
لیکن پاس آکر کچھ نہیں مِلتا مجھے
ناچار، امنِ عامہ کی چغلی لگاتا ہوں
خود اَپنے کان کھاتا ہوں
روایت ہے، سڑک ایسی نہیں
جو اِک مسلسل رَفت و آمد کی سہولت دے سکے
پہیے سے خدمت لے سکے!
تب اَپنے زناٹے سے شرمندہ
بہت تازہ تریں مُڈبھیڑ کا چکّر چلاتے
آگے جاتا ہوں
جو پُشتیں سامنے تھیں، اَب وہ
پیچھے رَہ گئی ہیں
اَور ماتھے سیدھ میں ہیں میرے ماتھے کے
جبینیں طیش میں، تابندہ تیور ـــــ
تیوروں کے مجرمانہ، قوس اَندر قوس، جھتّے
حلقہ بند اَسرار، سَر کی گٹھڑیوں کے
آدمی دَر آدمی دَر آدمی!

حادِثے کے فاصلے سے سارا کچھ
کتنا مکمل کتنا مہمل
روز کی یہ ڈائری
اور ڈائری کے آج کے صفحے پہ
یہ گزرا ہُوا انسان
یہ بیتا ہُوا انبوہ اِن قسطوں میں رائج
سکۂ رائج کا پیتل اور تانبا
کاغذی کھنکا کھنک کھنکا
کہ پھر ٹکرا گئی گاڑی میں باہر آ گرا ہُوں
ڈائری لکھتے ہوئے ــــ اور
لیجیے یہ آج کے صفحے کی سطرِ آخریں ہے!

حادِثے کے فاصلے پر مَیں پڑا
اِک اگلے زنّاٹے کی چغلی کھا رہا ہُوں
تیری جانب آ رہا ہُوں
اور میری پیٹھ پر
وُہ بھاری کُولھوں والے بیٹھے
اور بھاری ہو رہے ہیں
چوڑے ماتھے، اور چوڑے ہو رہے ہیں!!

سانولی سوار

وہ زیرِ تربیت مرے
قرار دی گئی اُدھر
اُچھال دی گئی اِدھر
میں دفتری دُخان کے
دُرست نادُرست درمیان میں تھا
مرکزہ معاملہ تھا
فائلوں کے فاصلے سے ہانکنے لگا اُسے
سبق کا اوّلیں وَرَق
وَرَق کی پہلی سَرگزشت
میز کے وہ اُس طرف تھی،
اور مَیں تھا اِس طرف

مہار کھینچ کر اُسے بتا دیا
کہ گردنوں کے خم پہ میرے چابکوں
کی سُرخیاں رواں نہیں
تو اَیسا ہو بھی سکتا ہے
نظر کے ایک نَعل سے،
مِرے سُموں کی چھال سے
سُنو کہ میرے سیکرٹ کو سیکرٹ رکھو گی تم
مِرا معاملہ یہ ہے
کہ دِن میں چائے چار بار،
بار بار ٹائلٹ،
میٹنگوں کی اِشتہا ہزار بار
باری باری زِندگی سے مَوت سے مُعانقہ
مآلِ کار کی دُھنوں پہ رقص ـــــ اِجتماعی رقص
سرسری تبادلہ تباہیوں پہ
مشرقوں سے مغربوں سے چھیڑ چھاڑ
اَور بس!

سبق کا جانے کون سا وَرق تھا ـــــ وہ
جب آئی اور کہا کہ سر!
ابھی جب آپ ٹائلٹ میں تھے
تو پُوری فیکٹری میں آگ لگ گئی

کہ فائلوں سے فاصلہ جو پہلے روز تھا
گئے برس میں وُہ نہیں رہا
حساب بے حساب ہو نہیں رہا
مجھے تو کچھ سمجھ نہیں، یہ لوگ کس طرح کے ہیں
نکیل ڈالیے اِنھیں
یہ اپنی تھتھنیوں کی رال ہم پہ پھینکتے ہیں کیوں
یہ دیکھیے نا،
آپ اُدھر وہیں پہ ہیں، جہاں پہ تھے
یہ میں اِدھر، جہاں پہ تھی
یہ نعل بھر خلیج اور یہ فائلیں
یہ دستخط پہ دستخط
کوئی پھدک پھلانگ ہے نہ مانگ ہے
گزارا ہو رہا ہے میرا ٹھیک
اور بہت ہی ٹھیک
نکیل لایئے تو سر،
میں اُن حرامیوں کو جا کے
بھیجتی ہوں اصطبل
جہاں کے ہیں، وہیں رہیں!

سبق کا شاید آخری ورق ہے یہ
گھڑی میں ساز موت سے معانقے کا بج اُٹھا

یہ روز کی روٹین کا مُعانقہ ہے
اس میں کچھ نیا نہیں
کئی برس سے تم نئی ہو ـــ بس
تمھیں سکھا دیا ہے سب
کہ باس اخیری سانس لے
تو کس طرح سے ہاں میں ہاں
ملا کے کھیلنا ہے مَوت مَوت !
کارپٹ پہ مَوت مَوت ـــ
اوڑھنی میں موت مَوت
اَور زندہ ہو کے پھر سے،
فائلوں کے فاصلے پہ جا کے
بیٹھنا ہے کس طرح
میز کی نگاہ میں
جہاں جو تھا، وہیں وہیں !!

سِیدھے سِیدھے اُلٹے

کَن انکھیوں کے مزے لیں
شہر بھی، مَیں بھی
زمیں بھی، آسماں بھی
مکاں بھی، لامکاں بھی
اُڑائیں گُل چھرے اِس قطعِ نظّارہ
کے گھیرے میں
کوئی سالِم سہُولت،
اوّل و آخر کوئی قائم قدم رغبت
نہیں اَب اِس پھریرے میں
جو ترِچھے تیوروں کے مُنتہا میں
پُورے کا پُورے سما جائیں

وہ کیوں سیدھے کیے جائیں
تباہی چلمنوں سے ہو کے آتی ہے
کسی خطِ خرابی سے شروع و ختم کے
نقطے نہیں ملتے
یہ ترغیبوں کا غُل،
ہُشکار، جزو کُل
اِشارہ مُعتمد،
موجود کا موجود ہے، نابود کا نابود
اچھا ہے، رہے باقی خلائق میں کجی
ٹیڑھی محبت کی ٹہل سیوا
شگن کے شبد اَپنی ٹوک میں بے ٹوک
ہکلانا مبارک فعل ہے، ہکلایئے —
ہکلایئے تو عالمیں سے داد آتی ہے
دُہائی کی
بہت شاباش،
اے شاباش کو ترسی ہُوئی دُنیا،
مزے کا کام ہے
اِس زاویے پر اِسراحت،
بے طرف کی ٹیک،
جو ہم بستری سے بھی
ذرا آگے کا آسن ہے

سُنو آسن درازو'
اِک یہی موقع ہے کرتب بازیوں کا!
پھر نہ جانے آنکھ کے بھینگے'
زباں کے توتلے'
لحنِ مرتب کے یہ نَو آموز، نواَفروز
اور حرص وہوس کے سب کھرے کھوٹے
اکٹھے اِس طرح سے ہوں نہ ہوں
اِس موج میلے میں
کَن انکھیوں کا یہ لپکا
سیدھے رُخ سیدھے سُبھاؤ
بے ضرر مارا نہ جائے
بے خطر خالی نہ جائے
آخری خلقِ خُدا کا اور خُدا کا وار ہے
یہ بے مزہ مت کیجیے
بس سیدھے سیدھے اُلٹا رَستہ لیجیے!!

چیونٹیاں چلیں سُسرال

ہنسی نکل گئی مری محاذ پر
مُحاصرے کے دو طرف دراڑ جیسے تن گئی
زمین پر کوئی لکیر بن گئی
الف اُنھیں کھنچا کھنچا یا مل گیا
تو ایل او سی کی باڑھ سے
گزر گئی ہیں چیونٹیاں
پیادگان لاڑھیاں، بجی بجی سواریاں
بیاہ ہے اُدھر کی ہم قبیل سے
اِدھر کے ایک چیونٹے کا
بھادروں کے آج کل میں
دھوپ کے اَدل بدل میں
آپ کو حوالدارِ دعوتِ طعام ہے،
ضرور آیئے گا!

میں شگن رسیدہ ڈنک سے
بغل کھجا کے رہ گیا
نشانے سے پھسل گئی نگاہ، اور
توپ کی دو نالیوں میں شادی گھر اُمنڈ پڑا
بتاشا منہ میں بھر گیا
بدھائی ہو، دُلہا دُلھن
زمین و آسمان کی رضا پہ راضی ہو گئے
اِدھر کے گوشت خور تھے
اُدھر کے ویجی ٹیرین تھے
چیونٹے اور چیونٹیاں
یہ توپ کیا سُرنگ تھی
گھسٹ گھسٹ کے کُہنیوں کے بل گیا
ٹٹولتے ہوئے ازل ابد کی راہداریوں میں
آدمی کو آدمی کہ جس کی کوئی حد نہیں
مگر یہاں کے بارمیں، سنگار میں
بس آدمی سند نہیں
مِری شناخت ویزا تھا نہ پاسپورٹ
ایک دم سلامتی ہلامی دے کے آگیا'
رُکا نہیں
گھسیٹتے ہوئے بدن، دو رویہ نالیوں
کی جنگ میں، سُرنگ میں

کہاں پہ چُوک ہو گئی
پتا نہیں چلا کہ حملہ ہو گیا
دُلھن کی رُخصتی کا وقت تھا
تمام گوشت خور اور تمام ویجی ٹیرین
مُحاصرے میں آ گئے
ہنسی اکھڑ گئی مری مَحاذ پر
وہ قہقہہ جو ایک تھا
اَب ایک تھا یا دو جُدا جُدا تھے،
سالے — قہقہے
وہ چیونٹیوں کا ایک نصف جو اِدھر کا تھا
اِدھر گِرا
جو دُوسرا اُدھر کا تھا اُدھر گِرا
زمیں کے اَندرون سے
اُمنڈ کے آ گئی تھیں وارثوں کی ٹولیاں
کسی سے لیکن اپنی اپنی چیونٹیوں کی میتیں
شناخت ہو نہیں سکیں
ہنسی بدل گئی مری
اِس ایل او سی کی باڑھ میں،
کباڑ میں!

کبھی تو مِرے سَر بھی آ!

میں دیکھوں
اگر تیرا بارِ تماشا اٹھاتا ہوں تو
آتا جاتا ہوا کیسا لگتا ہوں
اپنے اندھیرے سویرے کے
موجود میں
اپنے معبود کے سامنے
اپنے معدُوم میں، اپنے نابُود میں
اے مِری مہتمم — اے مِری ناظمہ،
میرے دورانِ خون و خلل کو بدل
اِس بدَن بند، دَر بند چوکھٹ پہ چل
میرے چوپٹ اَزل،
میرے چوپٹ اَبد!

میری یک طرفہ بیہودگی سے اُلجھ
ہفت حالی کی گھنٹی بجا
میرے طرفین کو اپنی نوکِ سَما سے کھجا
یہ چھناکوں، دھمکوں کا بدمست
بازار ہے
اور بازار بھی کیا ہے
دُنیا کا دُنیا سے اِنکار ہے
ایک سرپٹ توقف کے دوران میں
کیسا انبوہ ہے، کیسا انبار ہے!
ایسے انبوہ سے، ایسے انبار سے
تُو الگ، تیرا بارِ تماشا الگ
تیرا خودمَست چھنکا جُدا کا جُدا
تیرا خودکار لپکا خبر کی خبر اور خدا کا خدا
اے خبر ہی خبر — اے خدا ہی خدا،
میرے مَوہوم کی لانہایت
کسی کے مُماثِل نہیں
میرے کاندھے کے تِل ایسا تِل بھی نہیں
لے میں جھکتا ہوں، تُو اپنی گٹھڑی بڑھا
مرے سَر بھی آ!!

اکہرے تار کی دُنیا

دُہائی ہے دُہائی
سُوئی کے ناکے سے بھی
سالم نکل آئی خُدائی
خُدایا، تیری خلقت کی دُہائی!
سلامی سالموں کو
اِس سِرے سے اُس سِرے تک
جوڑ کو بے جوڑ ثابت کر دیا
ہر ہر سلامی اِبتدائی اِنتہائی
آگے آگے آدمی ناکے سے نکلا آدمی
پیچھے پیچھے چرنے والی کوئی شے تھی
اُوپر اُوپر اُڑنے والی کوئی لَے
آدمی گزرا قدم رکھتے ہُوئے
بخیہ بُنت کے بھیس میں

خاشاک کے ناچاک سے، ہر چاک سے
اُس چوَری چادر پہ کچھ دِو وقتی بیلیں اشتہا کی
پنجگانہ گانٹھ گِرہیں
ہنسنا رونا سب پرونا پڑ گیا
یوں چڑھ گیا چادر پہ جیسے
چال کی رنگ آزمائی ہو
چہار اَطراف کی رَنگین رَوِشنگین رَم
اَندر قدم، باہر قدم
چارہ کہیں، چوگا کہیں
گل بُوٹیوں کا جنگلی خنّاس شہروں کے گلاب
خوشبوؤں کی بدلحاظی، بدکلامی
دست کاری کے نمونے مشتہر
بازاری منصوبوں میں ہر ٹانکے پہ ٹانکا منتظم
دُنیا ـــــ اکہرے تار کی دُنیا
کٹیلی دھار سے تیری
ابھی اِک آسمانی دائرہ کٹ کر، زمیں پہ آ پڑا ہے
نکیلی مارکا مارا یہ نیلا خط
اُفق اوجھل ہے، نمود اوجھل
بتا، یہ بھی کسی ناکے کا ناکا بن سکے گا!!

چَوپایوں کا مخرُوط

غسل خانے کی کوئی دیوار تو تھی ہی نہیں
باہری دروازے کی نم چھال سے چل کر
جہاں خورشید بی کے پانیوں کا نَل لگا تھا
اِس جگہ کی یم بہ یم پردہ دری تک
سارا گھر ہی غسل خانہ تھا
اخیری پہروں میں کچھ خاص راتوں کے
نہاتیں تو سمجھیے
صحن میں سبھی پڑی ہر چارپائی کی ہتلائی کی
قیامت نام کی شامت سی آجاتی
نہانا کس لیے ہوتا تھا، کیا معلوم
یہ اَشنان کی خلوت سُہاگن پر تو جچتی ہے
مگر خورشید بی تو — خیر
وُہ اِک ایک کر کے، چارپائی پُشت پر رکھتیں

اکیلی نَل کے گِرداگِرد اُن کو اِیستادہ کرتیں
سَر دھڑ کو ملاتیں ـــــ دُو قدم، پھر دُو قدم
دُو دُو قدم ہر کھاٹ کے دھرتی پکڑتی
باقی دُو، دُو اُوپر اُوپر ایک مخروطی ملن میں
ایکتا میں، ایک ہو جاتے
بچھونے بھینچ لیتے اپنے ریشم میں رواں
اِس غسل کے مخروط کو
اور پھر یہ بُرجی، پھر یہ چاٗنوبان کی محراب
نوک سَر سے نوکِ پا تک
اچھا معرضِ اِخفا میں لے جاتیں
عقب میں صبحِ کاذِب تھپتھپاتی آگے آتی
گھونگھٹ اٹھتا، اور بی اِس ملگجے میں
فاتحانہ پاؤں رکھتیں تسمیہ پڑھتیں
نہانے بیٹھ جاتیں، بے خبر گھنٹوں نہاتیں
آتی جاتی مَوج میں، ایک ایک چھینٹا
دُوسرے چھینٹے کو آنکھیں مارتا،
ہُشکارتا آگے نکل جاتا!
لفنگو، مُورکھو، بھاگو یہاں سے
جاؤ گھر میں ماؤں بہنوں کو پٹاؤ
ہش نگوڑی مائی کا کیا دیکھتے ہو!
بھاگ جھاگوں جھاگ

جھاگ جاگا، جھاگ سویا
جسم کا برتا ہُوا جھوٹھا، یہ نام و نم کھرا کھوٹا
کُھلے بندوں نکاسی میں مخل رہتا
خلل پر چونکتیں
جیسے کسی کو طولِ سجدہ سے اُٹھایا جا رہا ہو
ایک دم پاکی پلیدی اِک طرف رکھ کر،
وہ اُس سیلن میں اُٹھتیں
اُور نَو تعمیر مخروطی محل خود پر گِرا لیتیں
طہارت زخم بن جاتی
محل کے ملبے سے گیلے بچھونے جمع کرتیں
اپنی اِک اِک چارپائی کو ہٹاتیں
زیرِ لب دو تین بار آمین کہتیں
ملگجے کو چھوڑ دیتیں
رات میں جس کھاٹ کی باری لگی ہوتی
اُسی پر جاگتی جاتیں اکیلے صحن میں لیٹی
اکیلے پَن میں اپنے لاشریک و لافریق ایسی
— پیا کی بی،
یونہی بس ایک مخروطے سے آتیں
ایک مخروطے میں جاتیں
چار کونوں کی کوئی دیوار تو تھی ہی نہیں!!

شب بیداری

بساند مچھلی کی
رات، رانوں میں تیرتی تھی
برہنہ خطِ سفید کی تنگنائے میں
رُوسیاہ رُوحِ ازل کی بدرُوح پیرتی تھی
بساند کیا تھی
جو تیرتی تھی سفینہ راں
اِس خزینۂ سَیل میں اُتر کر
خُدا کا "ہم سے خطاب" سننے کو آگئے ہم:
شروع اپنے کلام،
اپنے ہی نام کے موجۂ مُبیں سے
شروع ایسی بساند سے،

جس کو ہم نے رانوں میں تیرنے کا
سبق پڑھایا!
شروع نقطۂ ذات سے
نطقِ اوّلیں سے،
شروع خطِ سفید کی آتشیں مچانوں سے
جن میں کھانے کو پھل اگایا!

خُدا سخن کرتا جا رہا تھا
وہ رات کیا تھی
شکستہ سیّال روشنی کے
ہزارہا قمقموں کی جانے مُراد کیا تھی
یہ لذتوں کے چمکتے جدوَل تھے
جن کی خانہ شمار آنکھوں سے جھانکتے تھے
— ہم اَور تُم
اِرد گِرد کے پانیوں میں
ممنوعہ مچھلیوں کو
ذرا جو بستر کی اِک شکن نے
شِکن میں اِک قمقمے نے
ہونے میں دیر کر دی
ہماری مچھلی پہ حملہ آور
اِک اَور مچھلی ہُوئی

زیادہ اتھاہ ست
جو زمیں تسبیح کے تنفس میں
اپنے دانے پرو کے فاتح قرار پائی
وظیفہ ٹوٹا طناب چھوٹی
شجر حجر کے خضور و غائب کی تان ٹوٹی
بسا نہ ـــــ بے باغ و بے بلاغت
خراب خلقت کی ہم نارہ
نہ ٹھیرتی تھی نہ پیرتی تھی!!

مخنّث

ہم کہ پیوست ہیں شہر کی عورتوں میں
ہمارا الگ سے کوئی قامتِ اِنتقامی نہیں
کوئی بھی منطقہ ایسا نامی نہیں
جس میں ہم اپنی اُوباشیوں کا
صحیفہ اُتاریں
کتابت کے رسم الخط و شدّ و مد سے گزاریں
زبر، زیر اور پیش کی بدکلامی کو ملحوظ رکھیں
کوئی گالی کُرتے کے بٹنوں میں ٹانکیں
یا شلوار کے پائنچوں میں جگہ دیں
کبھی زیر جامے کتر کر سروں پر سجائیں
عبادت کرائیں:

خُدا ایک ہے، جیسے لا ایک ہے

مرد و زَن سَر سے پا تک

بندھے ہیں خدا تسمہ پا میں،

دونوں بندھے ہی رہیں!

آج اُوباش مطلب بڑھے آرہے ہیں

الگ ریوڑوں میں

ہمیں راستہ دو

ہماری سواری میں اور ہم کناری

میں رَخنہ نہ ڈالو

سُنو، جو بھی ہو تم

یہ گالی تو ہونی ہے، ہو کر رہے گی

زن و مَرد کے چرنے چگنے میں

چوگے کا، چارے کا جو تفرِقہ ہے

رہے گا، رہے گا

سُنو، جو بھی ہو تم

مہینے کے ہر طاق، ہر جُفت پر

پھیری والوں کے پھیرے

رُجوعِ خُصوصی، رجوعِ عمُومی

اَشد حالت وحال کا رقص

رمِ باہمی، اِنتقامی خرُوج

اِس طرف سے اُدھر

اور اُدھر سے اِدھر
کچھ نہیں روک پاؤ گے
چلتا ہے، چلتا رہے گا!

صحیفہ اُتاریں!

مگر ہم صحیفہ اُتاریں بھی کیسے
جو اُترا ہے اُس کے مطابق چلیں
اپنے سُر تال میں
آدمیّت کا چھوٹا سا گولا سا بن کر
گدھی پُشت پر دونوں ہاتھوں
کو باندھے ہُوئے
دونوں کُولھوں کو پیروں کے
پنجوں پہ رکھ کر،
فرو جلسہ باز اور فرو جلوہ ساز
ایک چکّر میں آجائیں
پیوست ہوں، جیسے تیسے بھی ہوں
اور ایسے نظر آئیں
جیسے کوئی حاملہ چوٹیاں
چوٹیوں کی پناہوں میں قاتل
کچہری کے ڈر سے چھپے ہوں

پھر اک روز ہم کو سزا ہو

اُنھیں چوٹیوں سے یہ ذُو ہست گولا

— یہ نا ہست گولا گرے

پھر گرے اور جب اُٹھے

تو اُلٹے قدم ماپنے آئے جائے بھرم

— بستگی کا بھرم

ہم کہ پیوست ہیں شہر کی عورتوں میں

ہمیں خلیہ خلیہ اُگلنے پہ

آزاد کرنے پہ

سب عورتیں بھڑ پڑی ہیں!!

عبارتیں عمارتیں کہ وُہ

مُطالعے کی میز پر
سوالیہ نشان ہے
سوالیہ نشان تو مُطالعے کی جان ہے
یہ کھُونٹی جو عمر میں کتاب سے بڑی ہے
جو کہ لازماں کے وقت سے
مِری ہی میز پر پڑی ہے
چھال میں گڑی ہے آر پار
اوِر یہ آر پار ہی
کہیں خُدا کا سوواں نام تو نہیں
وہ گُم کلام تو نہیں
جسے کلام کے خبیر بھیڑیے نگل گئے

اور اِک رسیدی رال
میری میز پر ڈکار دی
یہ فعل ہے پیمبروں کی نقل میں کھُدا ہُوا
نزاعی رم بجس کا ہے، فساد پارسا کا ہے
قبیلہ وار باریاں حیات کی ممات کی
میں گھر سے لے چلوں اِسے
جو میز سے اکھاڑ کر، لیے پھروں گلی گلی
مُطالعے کی میز پر مُطالعہ رُکا رہے،
تو جو جہاں پہ، جس وَرق پہ ہو
اُسی وَرق، اُسی بلائے سطر پر جُھکا رہے
گلی گلی مِرا ہی اِنتظار ہو
مجھی کو لیں نشانے پر
گَروہ دَر گَروہ اپنی بے تکی کمان سے،
مچان سے
یہ لوگ میرے اپنے لوگ
ڈانٹ دیں کہ میں نے کیا
سوالیہ نشان کا مذاق ہی بنا لیا
یہ اِک نشان جس کے بارِ خط سے
ہاتھ مُڑ گئے
یہ دستخط ہتھیلی پر ہتھیلی بن کے جُڑ گئے
اِسے کبھی خُدا کہا

کبھی کہا: رِسالتوں کی جھونک ہے
کبھی بتایا:
رزمیہ ہے، بے بدل ہے
آدمی کا آج کل ہے،
نُور بھی ہے، نار بھی
خود آدمی کی مار پر یہ مار ہے
کبھی اسے اُلٹ دیا تو پنجہ بزار
رُو بہ سر ہُوا
کہ جیسے اَب گیا کہ اَب گیا
یہ آدمی کا پالتو
تو گویا اِک مذاق ہی بنا لیا
گمان کو سوالیہ نشان کو
تو ڈانٹ سُن کے گھر کو واپسی کروں
اُنڈیل دُوں یہ مُٹھیوں کا سب مذاق میز پر
وہ کُھونٹی، وہ نعل پھر سے گاڑ دُوں
مُطالعہ رواں کروں
جو گھر کو لے چلوں کبھی
جو گھر سے لے چلوں کبھی
سوالیہ نشان کو!

شریکِ کار

یہ وہ چوک چوکی ہے
جس میں سے دو دھاری
سڑکیں نکلتی ہیں
جادہ شماری کی رُو سے
مرے بقچۂ اختیاری کی بُو پر
بگڑتا ہے پہلے تو بندوق والا
بلاتا ہے اپنی مدد کے لیے
اک معاوِن سگِ چاق چوبند کو
سامعہ، ناظرہ میں سند یافتہ
صاحبِ فرق و فرغل
زمانے کا آج اَور کل

شکوہ و شمائل یہ گھنگرالا اندوہ کامل
مخاطب ہُوا تو
ملے آنکھ کے دونوں تل
ایک پنجہ گرہ پر پڑا
کُھل گئی میری گٹھڑی
برآمد ہوا جو بھی سامانِ سَر بند تھا
ایسی جلدی میں جو بن پڑا تھا
سفر پر نکلتے ہُوئے: بس یہی ہے؛
یہی ہے وہ آب اور یہی ہے وہ گِل
آدمی جو کہ تاریخ کو بھون کر کھا گیا
بُو جو بُقچے سے آتی ہے
اَصلاً بس انداز راتب کی ہے
اور روایت کی ہے
رال، راتب روایت پہ ٹپکی
تو بندوق والا
سمجھتا ہے یہ جنگ لمبی کھنچے گی
کمک چھوڑتا ہے وہ ذِل بینڈ، جن سے
عقب کے عقب گونجتے ہیں
وُہی فرق و فرغل
وُہی سامعہ اور وُہی باصرہ
شرقی ماتھے ہیں غربی ذہیں ہیں وُہی

لہر کی لہر ہیں، قہر کا قہر ہیں
بس یہی ہے، یہی ہے وہ راتب
روایت کے دو چار آخر کے لقمے
تو بہروپیا ہے بغل بچہ والے
ہم اہلِ نشانہ، سگانِ زمانہ کا
بھوجن چرائے،
لیے جا رہا ہے کہاں!
اے فساد الفساد
اے فساد الفساد
اَب اِدھر دے،
کہ جو بچ رہا ہے ترے کاف کُن سے
ہمارا ہے سارا!

آدھی تاریخ انساں نے خود چاٹ لی
آدھی کُتوں کی پلٹون کو ڈال دی
یا سماوی سماوی فساد الفساد
آیئے، دیکھیے، یہ وُہی چوک چوکی ہے
دُنیا کے نقشے پہ اَب جو نہیں
جانے کب سے نہیں!!

یہ وَلیے کا چکّر

خُدا رکھے وَلیے کو
اُس نے کہا تھا:
یہاں سے گئے تو جہاں سے گئے!
گلی سیّداں کا بگولا
وہ آدم کا اور ابنِ آدم کا جھولا
وہ ترکھان وَلیا' وہ لکڑ بدَن
جسم کی لکڑیوں کو اُٹھائے
گلی میں نمودار ہوتا تو
سارا محلّہ ہی تیار ہوتا
عرَب اُونٹ آیا، عرَب اُونٹ آیا
لو جاپانی گاڑی ٹرام آسمانی چلی!

تب وہ بھورا بُرادہ،
چپت چپٹیوں سے زیادہ نہ ہوتا
ذرا آکے رُکتا
تو آجاتا حرکت میں
پہلے تو کوہان کو جوڑتا، چپٹیاں ٹھونکتا
سَر کو دَھڑ سے مِلاتا، دو آنکھیں بناتا
پھر اِک دُم دُگانہ اور اِک شرم گاہانہ
دَم کھینچتا
دردِ زہ سے نظر ہی نظر میں گزر جاتا
اور پھر جنم لیتا اپنے ہتھوڑے کی ہتھی سے
ضربت کی پارینہ تکرار سے
مجمعِ عام کے سامنے
آفرینش سے اپنی وہ عُہدہ برا ہوتا
پیروں پہ یک دم کھڑا ہوتا
جیسے کئی سَو برس سے یہیں ہو
— گلی سیّداں میں
اِسی وَسط میں اور اِسی ہست میں
گوشت کتنا گُندھا، کیسا ڈھلکا ہُوا
کھال کتنی کَسی کیسی پالی ہُوئی
ہڈّی ہڈّی مہارت سے ڈھالی ہُوئی
اَب یہ کوہان حاضر ہے عربی کی کہتا

یہ جاپانی گاڑی ٹرام آسمانی چلی
ڈومنٹ رہ گئے ــــــ ڈومنٹ
پُورے چکر کی آدھی اٹھنّی
ٹکا دادی جاناں ٹکا دادا جانی
دُلھن اور دُولھا کا بھاڑا معاف
چلو چار آنے میں سارے طواف
آنے جانے میں گندا بھی صاف!

یہ وَلیا تھا
جو ہم کو سَیر و سفر کی ہَوا میں
عمُود اور اُفق کی سزاوار
معراج پر جا کے
ہچکولے دینے لگا:
آدمی کا بڑا مسئلہ آدمی ہے
یہ جھٹکا تھا
اور ہم بمشکل سنبھل پائے تھے
اُس کے کوہانی اَستھان پر
دِید نادِید کی سرغنہ ہے گلی، وہ گلی
آسمانی محلّے نہیں
اور دھرم کا دوشالہ
دوشالے پہ یہ بخیہ بازی

نہ طرفین راضی، نہ کونین راضی
وہیں ہم نے گردن جھکائی
اُسی اَوج سے
اور اُسی سَربلندی سے
اَعماق کا اِک نشانہ لیا
کل کیا تھا جو ضعفِ نظر کا بہانا
دوبارہ کیا
تب عرَب اُونٹ ٹھہرا
یہ جاپانی گاڑی بُرام آسمانی رُکی
دِید نادِید کے مخمصے میں اُتر آئے
واپس زمیں پر
کرایے کی آدھی اٹھنی اُچھالی
کہیں پر!!

یَومُ الارض

یہ جو تیوہاروں کا مقسوم ہے،
اِس کی رُو سے
آج پھر آج زمیں کا دِن ہے
دائمی دائمی دِن، عارضی عارضی دِن
اوّلیں آخریں بھی، آخریں اوّلیں بھی
خاکروبوں نے سلامی دی ہے
اپنے جاروب کش ایمان کے ساتھ
اپنی آواز کی خاکستر سے
دھیان کے دَسیوں دہانوں سے
گزر کر، مَر کر
پہلا سُر، پہلی اَذاں

یوں سلامی سے شروعات
ہوئی ہے دن کی
سب شگون اچھے شگن اچھے ہیں
دودھیاوں کے دُخان اُٹھے ہیں گلیوں گلیوں
جیسے انساں کا سروکار سب انساں کا اُبھار
کبھی پانی کی چڑھائی کبھی مٹی کا غبار
من کی موجی ہے یہ بڑھتی ہوئی ،
بڑھتی ہوئی بھیڑ
تنگنائے میں روایت کی لکیر ــــــ ابنِ لکیر
راہداری میں کہانی کی فنا ــــــ بنتِ فنا
بالکونی میں بقا
جشن کا بوجھ سہار اے مرے غائب کے غبار
اے مرے حاضر کے حصار
برسرِ نصفِ نہار
میڈیا سینے پہ چڑھ دوڑا ہے
ایک فوکس میں ملتا تھا بھلا آج کے دِن
جبکہ میں ڈھلتی ہوئی دھوپ
رِجھائے ہوئے ہوں
آپ تو جانتے ہیں میرے سیہ ، میرے سُفید
سبزگزران کی کن من کن من
نیل کے ہفتم و ہشتم پائے

سُرخ کے داخل و خارج سارے
میراثِ ہرمئی قدّ و قدامت کا
قدیمی اَندھیر
زرد اوِر گَرد کا پھیر
آپ تو جانتے ہیں گَرد کا پھیر'
اپنے گھماؤ میں اکیلا کب ہے!
ارض مفروضہ نہیں
اَور مفروضہ اگر ہو بھی تو میں جس کے لیے
پہر کو پہر سے ہانکے ہُوئے
اُس شام تک آیا ہوں
جو مفروضہ نہیں
یہ جو تیوہاروں کا معلوم ہے
اِس کی رُو سے!!

والنّاس تک

ناظرہ بی بی بہت خوش ہیں
آج قاسم شاہ کا قرآن پُورا ہو گیا ہے
زوج کا ارمان پُورا ہو گیا ہے
توبہ ہے
اس عمر کے بوڑھے کو یوں الحمد سے
والنّاس تک
آیت بہ آیت سب سُکوں سب حرکتوں میں
شدّ و مد کی رسّیوں میں باندھ کر رکھنا
اور ہکلاتے ہُوئے مخرج کی رالیں
یوں نگلتے اور اُگلتے شخص کو
اِس ربع سے اُس ربع تک

اس نصف سے اُس نصف تک
اور نصف سے آگے، ثلاثہ تا ثلاثہ ختم تک
بس رِحل کے رستے سے لے جانا
قیامت مرحلہ تھا
سب بہو بیٹوں کی پسپائی ہوئی
باپ کو پاکی پلیدی کون سمجھاتا بھلا
کون کہتا:
باؤجی! استنجے کے ڈھیلوں سے نکلو
گولیوں گولوں پہ یہ چاہی نجاہی دھار
جو شافی شفائی مانتے ہو
دَرس کا ٹپکا دَرس دھارا نہیں
باؤجی کو کیا پتا کس شرق کی
بانہوں میں سوئے
اور پھر کس غرب کے پہلو سے اُٹھے
اماں جی پر چھوڑیے سب باؤجی کا بار
صد سالہ اُدھار
ناظرہ بی بی بہت خوش ہیں
شادی والی اوڑھنی میں لپٹی لپٹائی ہوئی
سب پوتیوں، پوتوں میں شرماتی لجاتی
یُوں گھری بیٹھی ہیں
جیسے آج ہی ڈولی سے اُتری ہوں

میکے والا سیدھا، ٹیکا، ترچھا جھومر
شوق گہنا طوق گہنا
کھاٹ کھائی
چور گھونگھٹ
اک دُلھن اور ایک دُولھا ــــ زندہ باد!
تالیاں بھئی تالیاں
زردہ پلاؤ قورمے کی تھالیاں
آئیں آئیں
کھائیں پئیں اور موج اُڑائیں
سارے دادا دادیاں
دِدّی کی مدہوشی، ہم آغوشی کا
سامان پُورا ہو گیا ہے
دِدّو کا قرآن پُورا ہو گیا ہے!!

بااَندھیر

وُہ بااَندھیر کون تھا
جو بُرج بُرج بٹ گیا
نماز میں نپٹ گیا
خُدا کے گھر کی سیڑھیوں میں پہلی بار
دیکھ کر سمجھ میں آ گیا تھا
کس اَندھیر کی سویر ہے
وہ کیا خوشی سے حُجرۂ ترنگ میں پلا بڑھا
ترنگ اُس کا مُولد و مَقام تھا
اَذان اُس کا کام تھا
وہ لحن، بے پناہ لحن
آنکھ کی جھپک کہ اِنتباہ پر لگی ہُوئی

پپوٹوں کا شکن شعار اِشتباہ
رینگتا ہُوا سوال
جیسے دونوں گالوں پر
دھری ہُوئی دَو گالیاں
رُکے ہُوئے مکالمے
بٹی ہُوئی کہانیاں
بچے کُھچے بدن کے ڈنک
کچھ رہے سہے نہنگ،
حالتوں کے حال کے
خُدا کے گشت کے لیے
اِک آخری چبوترا تھا آخری مُنڈیر تھی
وہ با اَندھیر ___ اندھیر با
ہجومِ رفت و آمدہ کی بندگی مقام چال
جب چلا لڑھک گیا
نظر میں رہنے لگ گئیں تھیں صَف بہ صَف
وہ اَشہد و اِلہٰ کی گھنی گھنیری،
چھوٹی چھوٹی با اَندھیری پھیریاں
کبھی جو اپنے حُجرۂ ہَوا کی جالیوں سے دیکھتا ہُوا
اِحاطۂ خُدائی کے نشیب میں
خُدا کے گھر کے صحن میں
بہ رُوئے شرق غرب ایک منبرِ امام کو

خود اپنی چوبِ خال کی ہمیشگی میں محو
اُس براجمان اِمام کے غیاب میں
تو جالیوں کی روغنی رُکاوٹیں، روایتیں
کرید دیتا ناخنوں سے،
دَوڑ جاتا صحن میں
اور نشستِ خالی پر نشست کرنے بیٹھتا
بغیر اذن و اطّلاع
کسی سمیع کے بغیر، کسی بصیر کے بغیر
اِمام کی، اِمام کے بیانیے میں
نقل اُتارتا ہُوا
ز رُوئے شرح سب مخالفیں کو مارتا ہُوا
اِحاطے میں لکیر کھینچ دیتا اور پکارتا
اِدھر کی خلق اَور ہے، اُدھر کی خلق اَور ہے
شمال اور جنوب اَور اَور ہیں
طُلُوع اور غروب اَور اَور ہیں
وہ بے ہجوم و بے محل بھی
اِقتدا طلب بگل بجاتا،
جانے کس اَذان کا
پڑھتا تا پھر نماز پیش اِمام کے طریق پر
اُسی کے جانماز لاشریک پر
اور اُس کے بعد دَوڑ جاتا

روغنوں، روایتوں کی مستقل پناہ میں
پھر ایک دِن
وہ رات رات بھر کی مشق
نقل کی خبر خبر
کسی طرح سُنی گئی عوام میں
تو حجرۂ سوالیہ بھی مِٹ گیا
اَندھیر با کا ہر سُفیدؔ ہر سیاہ پِٹ گیا
اِمام کے اِقامتی اشارے پر
نماز میں نمٹ گیا
تو گھر کی بات گھر میں رہ گئی، وہیں
سمیع کائنات میں،
بصیر شش جہات میں!

دُور اُفتادہ مَکالمہ

آپ اُسی بند گلی سے ہیں نا'
جہاں کا میں ہُوں
ایک بھر آئے ہوئے موڑ پہ جو پڑتی ہے
دُھوپ کے اُلٹی طرف
سُرمئی گمنامی میں گُم واقعہ رُخ پر سیدھی
سیدھی' بے سُدھ
بے نمونہ سی گلی گلیوں میں
فرش پر اینٹ لگائی نہ لگائی' وہ گلی
قرمزی — جفت کہیں' طاق کہیں
حَد ہے' حَد ہے —
عددِ اعداد کی حَد ہے' عدم آبادی ہے

بولیے ایسا ہے، ایسا ہے نا!
آپ کو دیکھا ہے اکثر اُسی آبادی میں
دِن کے دوران میں تلووں کی طرح
گھستے ہُوئے
رات، چکّی کی طرح پستے ہُوئے
گھر کی بنّی سے نمٹتے ہوئے آتے جاتے
صحن کے چھاج میں چھنتا ہُوا رقّاص،
اَناج آپ ہیں کیا؟
چھانٹ چھانٹن سے اَٹے
آپ بھی پُور، پراگے سے
زیادہ تو نہ ہوں گے شاید
گھر کی تاریخ نہیں ملتی مگر
میرا اندازہ ہے کمرے نہیں
کچھ باڑھیں ہیں اُلٹی سیدھی
پاؤں سے گیلی سَروں سے سیلی
نیند کے نقشے پہ
سب چھوٹے بڑے، بُوڑھے، دوپایے گڈمڈ
آپ کیا کہتے ہیں اس بارے میں
گھر، گلی سے کبھی موقع پا کر
—— چھت پر جا کر
اپنے تہبند کچاوے میں ذرا مُنہ جو دیا ہوگا

تو کیا یاد کیا ہوگا تب
چلیے اَب یاد نہیں ہے تو کوئی بات نہیں
ہم کہیں پھر جو ملیں گے تو میں پھر
پُوچھوں گا
ہم اُسی بند گلی سے ہیَں نا،
جہاں کے ہم ہیَں !!

مِستری جی گھر نہیں سِیدھا!

مِستری بندے علی تو
کب کے پیارے ہو چکے اللہ کو
اَور وُہ کاکا نواب
ان کا جو خطِ راست تھا ___ مزدور تھا
چوری چلم پینے میں بھی مشہور تھا
آج بھی سُوٹا لگاتا گڑگڑاتا
مِل ہی جاتا ہے کسی تعمیر، نَوتعمیر
کے پچھواڑ میں
ایک ہی گرِمالہ کانڈی پر کھڑی
دُنیا کے پیچھے
سُوت، سُوتر سے ذرا ہٹ کر

تباہی سے زیادہ تیز تمباکو کی خاطر
بس ذرا سی مُنہ زبانی بات پر زندہ
ایک ایسی بات جو لکھ کر نہیں دیتا کوئی!

میرا گھر بنتا تھا
اور سیڑھی کا پہلا پائدان اُٹھتا تھا
جب ریتا مسالا ہُر پہ رکھے آیا
اور گھبرا کے بولا:
مستری جی، اس طرف سے گھر نہیں سیدھا
جب بھی حُقّے کی نَری سے جھانکتا ہُوں،
گُھوم جاتا ہُوں
ٹیپ تک مسطر کے متوازی نہیں
سوچتا ہُوں، ہاتھ ہو جائے نہ مالک سے!
مستری، جو سیڑھیوں کا آنا جانا کر رہے تھے
دونوں بالشتوں کے مُنہ کھولے
جیسے غرّائے:
ابے، چوری چکاری کی چلم تمباکو
اور یہ تُو ـــــ ترا یہ مُنہ
اُونہہ ـــــ کیسے کہہ دیا ہے، گھر نہیں سیدھا
کہ جیسے گھر نہ ہو، کُتّے کی دُم ہو!
جا، مسالا لا ـــــ مسالا

دیکھ پھر بندے علی،
سیڑھی کو سُدھ سیڑھی کا کیسے موڑ دیتا ہے!

تین[۳] ضربے دس[۱۰] برابر تیس[۳۰] برسوں میں
سولہ[۱۶] سترہ[۱۷] پائدانوں پر تکی سُدھ سیڑھیاں
جوڑا جوڑا پاؤں، جوڑا ایڑیاں
پی گئیں، یا کھا گئیں
یا کیا ہُوا
مستری جی سب کچھ اُلٹا ہے
مان لیں،
چوری چکاری کی چلم نے ٹھیک پھونکا تھا!!

کنواں

کنویں کی بات کیجیے
کنویں کا ساتھ دیجیے
کنواں جو درمیانِ شہر بندشوں کا باب ہے
جو اِبتلائے خشت و خاک مبتلائے آب ہے
یہ مبتلائے آب، اِبتدائے آب بھی تو ہے
یہ اِبتدائے آب، اِنتہائے آب بھی تو ہے
بلائے آب، ماورائے آب بھی تو ہے
نِدا بھی ہے —
نِدا کہ جو جنم جنم سے
صفر جمع صفر کے بھنور بنائے
ہمارے لاشمار کے شِکار تک
اُچھل اُچھل کے آئے

آدمی کے لمس کو ترس چکی
فقیرِ بے ندائے آب
فقیر کے قریب سے گزر کے دیکھیے ذرا
یہ دونوں ہاتھ، دونوں پاؤں
بیڑیوں کے جیسے، ہم سیاق،
ہم سَباق — باب
ہم نشست، ہم سبق
حجاب اور حدود کے اَدق وَرق
فقیرِ بے —
فقیر جس کے سینۂ خموش پر
چھنا کا وار خود کلام جھُرّیاں ہیں
چھینٹ چھینٹ آر ہے نہ پار ہے
یہ بحر یہ — نبوّتوں کا بار ہے
— یہ بوجھ بانٹ لیجیے!

یک دست حجام

ایک قینچی ہی تو چلانی ہے
کوئی پانچ اُنگلیاں چلالیں گی
شیشۂ ہم شبیہ کی توسیع
یہ دُکاں یہ چمار ناخواندہ
بال بنوا نہ لوں یہیں سے میں
اگلا بازار جانے کیسا ہو!
یہ، مگر اِشتہار ـــــ بیہودہ
عورت اور آدمی نگارندہ
ایک جوبن کے دونوں کارِندہ
مُو بہ مُو زِندہ،
باہر ایسی قیامت آئی ہے

جانے حجّام آگے کیسا ہو
پھر بھی چلتا ہوں، دیکھ لیتا ہوں!

اوہ ــــ اِس کے تو ہاتھ بھی نہیں صاف
زوپ بہروپ پر کمر بستہ
غسل، استنجا اس کا کیسا ہے
شاید اِن اشتہاروں جیسا ہے
اشتہاری مُباشرت میں شریک
دونوں طرفوں کو عکس بندی کا
خرچہ پانی بس اتنا ملتا ہے
جس میں سے غسلِ فرض کی خاطر
چار چھے آنے بھی نہیں بچتے
یہ طہارت نہاد بے چارہ
میرا خط کس طرح بنائے گا!

ذات کا نائی ہوں مُصلّی نہیں
آپ تو ایسے گُھورتے ہیں مجھے
جیسے کعبے پہ ہاتھیوں والا
لشکری، میرا باپ دادا تھا
جیسے قرأت کے سہو کی بانی
میری دادی ہو، میری نانی ہو

جیسے ننّاوے نبی کے نام

میں نے ہکلا کے —

توبہ توبہ نعوذ:

— میں

گرم حمّام تھے جو اُمّت کے

میرے غوطوں سے ٹھنڈے پڑ گئے ہوں

کسی نائی کی کیا مجال جناب!

بات خط کی ہے گر تو پھر کیا ہے

میں نہیں تو یہ میرا چھوٹا ہے

ایک قینچی ہی تو چلانی ہے

کوئی پانچ اُنگلیاں چلا لیں گی!!

بینؔ گرام بال

خاکروب آیا'
گلی میں پھر گیا
روز کا یہ فجری اُڑتا فلسفہ ہے
خیر ہو اِس فلسفی کی
اِک مجلّد نیند کو صفحہ بہ صفحہ
نوچ کر پھینکا ہُوا چوراہے میں
دین و دُنیا کی نظر سے بچ بچا کر
دیکھتا جاتا ہے وُہ
نقطے سے نقطہ مِلاتا
جملے سے جملہ بناتا
اپنی جھاڑو پھیرتا جاتا ہے وُہ
سینۂ صاحب پہ رہ رہ کر اُبھرتا
تپتی تاریخوں کا تا ٔبا'

پاپی تہذیبوں کا پیتل
اِک صلیب اور اِک حبیب، اعلان ہے
رات کے سارے گناہوں کی معافی ہو چکی
دِن نکل آیا ہے جارُوبی عقب کی آڑ سے،
جمع دارانہ جھنک جھنکار سے!
کل بھی دِن نکلا تھا
اور وُہ کچرا گیری خاک رُوئی
سُرخ رُو ٹھہری تھی
جب دسیوں ہدف اَہداف سے
شاپر بھرے
وُہ لے کے لَوٹا تھا
روز و روزینہ کی رَو
تسلیم و تخمینہ کی پَو
خاکروب آتا ہے اور میں دیکھتا ہُوں
انتخاب اور اِنتقام
صاحبانِ سَر کا مُو بدلا دوام
اِس گلی والوں کا ماضی اَور حال
بال، ضائع بال
کچرے میں سے جو بھی مِلتا ہے
سب اَپنے کیسے میں بھر لیتا ہے
اور تولتا ہے بے ترازو ___ تولہ تولہ

جمع پونجی ایک سے بڑھ کر ہوئی ہے دو گرام
دو سے آگے تین تک،
بس سیڑھیاں ہی سیڑھیاں ہیں
— تنکا تنکا سیڑھیاں
تین ہوں گے تو کباڑی دس روپے دے گا
گراموں کے عوض
اور پھر یہ بال کس بہروپ کا
کُنڈل بنیں گے
کن بھنوؤں کی باڑھ،
کن آنکھوں کی پلکوں کو جنیں گے
آدمی پر بُن دیے جائیں گے سارے
دھاگا دھاگا بھانت بھانت اعمال
کب کے بے علاقہ بال
یعنی کنپٹی پر بھنبھناتی مکھیوں کا جال!

دس روپے کے دس ہزاری فاصلے سے
خاکروب آیا
گلی میں پھر گیا
ایک بال اس کے بھی سر سے گر گیا!!

اَپنا اَسرار مَیں نے کہاں دے دیا!

اِطاعت کا اِک مستقل رزمیہ ہے
یہ تمثیل و تیور کی نامختتم جنگ ہے
اَب سناؤں تو ممکن ہے
ہر بات، ہر وار، قابو میں آئے نہ آئے
چلیں فرض کرتا ہوں:
جب میری آنول کٹی تو مری سِرّیت کا
پٹاخا بجا
پہلا غوغا تھا جو کچھ سُنا، اَن سُنا رہ گیا
یہ سُنا اَن سُنا، یہ کہا اَن کہا
کوئی دُم چھلّا ثابت ہُوا، جو کہ بڑھتا رہا
اور عقب سے مجھے آلیا ایک دِن

پھر مری چوکڑی گھٹتے گھٹتے، سمٹنے گئی
لغو گھیرے میں گھیراؤ میں
نقطہ ساں گھاؤ میں
میرے اَسرار کی ریزگی گلیوں گلیوں بٹی
ہم کناری میں
شب باشیوں کے وہ سکّے چلائے گئے
کچھ چلے، کچھ نہیں
بوریا بند بستر دِکھائے گئے
کچھ دِکھے، کچھ نہیں
جنگ میں یہ کرنسی بہت کام آئی
کہ دو وقت کی دال روٹی تو چلتی رہی
رازداری رکابی میں کفگیر میں
پانی پینے پلانے کی اس اوک میں
تیر کی نوک میں
میری بندوق کی نالی نالی میں
یا فاتحیں کی ہر اک گندی گالی میں
لقموں کے ساتھ، اور چکموں کے ساتھ
اِنتہا کی طرح لچکچائی گئی اور چبائی گئی
بولتے بولتے یرغمالی بنا
رول نمبر لگا
قیدی نمبر اٹھارہ [١٨]

وہ سترہ[۱۷] جو پہلے سے تھے،
ڈیڑھ بالشتی دُم سب کے تھی
میرے جیسے چبائے ہُوئے،
مجھ سے کہتے تھے:
اَسرار بھی کیا عجب چیز ہے
آدمی کم سے کم بھُولتا تو نہیں
مُنہ میں آئے ہُوئے تھوک کو
پھر سے واپس نِگلنا
نمِ ناف کی مُہرِ ناموس کو ثابت و ثبت رکھنا
علائق میں سِرِّ سکونت کی سیٹی پہ کرتب دِکھانا
بھرم کو بھرم سے مِلانا
وہ کہتے تھے سترہ[۱۷] میں اٹھارھویں کا اچانک ظہور
ایک بے وقت کا بوجھ ہے،
بارِ تمثیل ہے
اَور تاریخ کے یہ وسائل نہیں
جو تمھیں بھی بغل میں دبائے
کھلاتی پلاتی پھرے
آج پھر قیدی نمبر اٹھارہ[۱۸] کی پیشی ہے
اور اِستغاثہ ہے
یہ آرے پارے ہے
ایک جیسا نظر آنے والا ہے

جیسے ترِیڑا کنارے کنارے نبیڑا ہُوا
اپنا چھوڑا ہُوا' اپنا چھیڑا ہُوا
نظم لکھتا ہے' چھوڑیں اسے
ایسے دُو طرفہ ماحول میں یک طرف
چلیے ملتے ہیں اُن سے
کہ جن کی اطاعت ابھی طے نہیں
جن کے تمثیل و تیور کوئی شے نہیں!!

مِیڈیا ٹرائل

ہماری تمھاری ملاقات اَب
اِشتہاروں میں ہوتی ہے
ہوتی رہے گی
کسی پردۂ برق و باراں کی چوکور میں
کائناتوں کی اِن مشتہر منڈیوں میں
اِدھر سے ہمیں اور اُدھر سے تمھیں
عکس بندی کے اَسرار دے کر اُتارا گیا ہے
ہمیں مطمئن کرنا پڑتا ہے
بازاروں بازاروں
بہکی ہوئی بِھیڑ کو
بِھیڑ جس کا بھلا نام خلقِ خُدا تھا کبھی

اَب کسی نام سے بھی پکارو
تو یُوں چونک اُٹھتا ہے مجمع میں ہر کوئی
جیسے اُسی کو بلایا گیا ہو
لپکتے ہیں لوگ
اپنے ٹی وی کا دروازہ توڑیں گے یکبارگی
اَور گھس جائیں گے
نشریے کے مُقابل میں مدِمقابل
جہاں فلم کی بے اَدب، بے لحاظ
ایڈٹنگ ہو رہی ہو
اشتہاروں میں اَب مشتہر کچھ بھی کیجے
یہ چھینٹے جو رَہ رَہ کے خبروں کے اُڑتے ہیں
پڑتے ہیں اُن دامنوں پر بھی جو رَہ میں
پڑتے نہیں ہیں
بڑا ظالم اِس حاشیے میں کھڑا کیمرا ہے
کوئی دانہ دانہ جُگالی کرے
تھال کو جس طرح سے بھی خالی کرے
کوئی پوروں کی پوشیدگی میں
عبادت کا رُخ موڑ دے
توڑ ڈالے پپوٹوں کی اِک جھرجھری سے
خدا کی چھڑی
کھُونٹی پر لٹکتی ہوئی لاش کو بھی یہ جا چھیڑتا ہے

ہمارا تمھارا کفیل اِس طرف کیمرا '
اُس طرف کیمرا
ہماری تمھاری ملاقات اَب نشریاتی
اِداروں کی رہداریوں میں
نکیلی کٹیلی اداکاری کرتے ہُوئی ہے
تو ہوتی رہے گی
یونہی بے سَروپا
کسی حادِثے میں کہیں جیتے مَرتے
کسی واقعے کا کبھی پانی بھرتے
اِدھر سے ہمیں اور اُدھر سے تمھیں آنا پڑتا ہے!

معلوم ہے —— ایک اَیسا بھی اَندھیر ہے
اَیسا بھی پھیر ہے
جس میں ہم آتے ہیں
تم نہیں آتے ہو
دُور سکرین پر کچھ بھی آتا نہیں
ایسی مشہوری کوئی چلاتا نہیں!!

وہ نابینا بولی

مِرے سَر پہ گٹھڑی رکھا دو!

میں گھر سے چلا شام کے کام کرنے
گلی کے تسلسل کو توڑا ہی تھا
ایک خود کار سا موڑ مُڑتے ہُوئے
میری رفتار کی جگ ہنسائی ہُوئی
مجھ کو ایسے لگا ـــــ میں مکاں سے نہیں نکلا
کون و مکاں سے نکل کر، دبے پاؤں
بازارِ دُنیا کا رَقبہ، قدم تا قدم ناپتا
اپنے معمول کے کام کرنے
سرِشام نازِل ہُوا ہُوں تو یہ جو ہنسی ہے

کوئی ایسی بے جا بھی کب ہے
زمانہ کچھ ایسے تھا، جیسے گلی
آدھی پیچھے تھی اور آدھی آگے
سمجھیے کہ آگے سے آگے
یہیں آج کی دھوپ کے وسط میں
سوگزرے شہر کے درمیاں درمیاں
اُس کی گھڑی گِری تھی
اُسے قہقہوں سے لگا ہوگا
شاید یہ آبادی ہے،
جس کے بننے کے دن ہیں
وہ روئی بھی ہوگی کہ کیا ہو رہا ہے
بہت وقت ہے شاید ایسے اندھیرے
محلّے میں لوگوں کے پاس
اور اُس وقت کو ختم کرتے ہیں
باچھیں کھِلانے سے، نتھنے پھُلانے سے
باہر تھڑوں پر تھڑوں سے دھرے آدمی
مجھ کو وسطِ زمانہ کی بیہودگی سے غرض کچھ نہ تھی
اور تو اور بڑھیا پہ بھی بڑبڑاتا ہُوا
میں ذرا رُک گیا اور چلنے لگا!

یہ وہ بازار ہے

ایک ہی گانٹھ نے ہے جو کھینچا ہُوا
ایک ہی گم گرہ سے بندھی،
چلتی پھرتی دکانیں ہیں جو
جستہ جستہ سڑک کی برہنہ روی کو
چھپا پائی ہیں
بہت رش لگا ہے
مرا حال یہ ہے کہ جو شے اُٹھاتا ہوں
لگتا ہے جیسے زمیں سے اُٹھائی ہو
مٹھی میں بے طرح مٹی بھر آئی ہو
اچھی رہی آج کے دن خریداری
واپس مڑا ہوں تو عین اُس جگہ بڑبڑاتا ہُوا
پیش بندی کے سب بند کھولے ہُوئے
تیز تر ہو گیا ہوں کہ ہونا پڑا ہے
جہاں میرے پیچھے پھر آدھا زمانہ ہے
آدھا پھر آگے
مجھے کہ آگے سے آگے!!

〰

آئینی ترمیم

تعزیت کی عبارت کو
آئین کی مستقل شق میں بدلا تھا جب
دو تہائی سے بھی کچھ زیادہ کا غَوغا تھا
اور تم نے دُو اُنگلیوں سے
نشاں وِکٹری کا بنا کر خدا کو دِکھایا تھا
اور یہ جتایا تھا:
دیکھا کہ گم نامیوں میں پڑی مَوت
کی نیک نامی کے دِن آگئے!
پہلی بار اِس ہدایت کو تصویر کی موت پر آزمایا گیا
اور چلایا پھُوہڑی پہ تصویر کی ــــ ہر مُنادی
کہ ظلِّ الٰہی کو خود چل کے آنا تھا

ہر تین کاندھوں کے ساتھ اپنا چوتھا ملانا تھا
یُوں ہے کہ جس دِن سے تصویر کا خوں ہُوا ہے
وہ صدمے سے دوچار ہیں، ہوش میں بھی نہیں
ہاں مگر قاتلوں کو بہت جلد مرحومہ کے اہلِ خانہ
کے قدموں میں سر کار لے آئے گی
کچھ شواہد ملے ہیں کہ اس قتل میں
سارے معلوم حربوں سے ہٹ کر،
کسی غیر معلوم طرزِ بغاوت کو برتا گیا
وارثوں کو یہ مژدہ ہو
جائے شہادت سے جو کچھ ملا ہے
وہ سب جمع کر کے کسی سترِ شرعی کا
خاکہ بھی کھنچتا نہیں
غیر مذہب تھے وُہ
دُوسری بار پھر اس سہولت کو برتا گیا
جب کہ آواز کا خوں بہا
سیڑھیوں میں سے جیسے اُتر آئے کوئی
دبے پاؤں ایک ایک تختے پہ اعلان کرتا
کہ دیکھو روانہ ہُوا ہیں
مشارِق کے مدفن میں اِک اَور مدفون،
اِک اَور باقی کی گنجائشِ نقل پیدا ہُوئی
تعزیت نامہ پہلے سے لکھ کر جو رکھا تھا

جب ظلِ سبحان کو وُہ تھمایا گیا
اُن کی آواز نکلی نہیں
لوگ سمجھے کہ جیسے وہ پھر کہہ رہے ہوں
کہ مقتول کو اللہ بخشے ___
ہماری حکومت کا بازو تھے،
قومی ثقافت کا دارومدار اُن پہ تھا
نغمہ خوانی ہو یا نوحہ خوانی
وہ ہر دِل کی آواز تھے
آپ گھبرائیے مت
اذانِ بلالی ہمارے لہو میں رواں ہے
بس اِک مہلتِ یک نفس دیجیے
کل سے یُو اَیس کا دَورہ ہے
ہم ستر کے غیر شرعی مظاہر کا نکتہ اُٹھائیں گے
سارے شواہد سمیت
اور وُہ جن کے ختنوں کی تاریخ ثابت نہیں
پھر بھی گُھل مِل گئے ہیں
اِدھر اہلِ ختنہ کی افواج میں
ایک دِن زائدِ کُفریہ سے
خمِ شرکیہ سے بھی جاتے رہیں گے
ہم اِس چربی چمڑی کی ساری گُندھی
گنجلکیں کھول دیں گے

اور اندر کا مُسلم نکل آئے گا
پُوری اُمت سے وعدہ ہے
سب ٹھیک ہو جائے گا!

آخری جب خبر آئی تو
ظلِّ سبحان کے گھر میں قاتل گھُسے تھے
ہوا کہہ رہی تھی
کہ گم نامیوں میں پڑی موت کی
نیک نامی کے دن آ گئے ہیں
اُدھر دو تہائی سے بھی کچھ زیادہ کا غَوغا تھا
ایوانِ شاہی میں پھر غوطہ زن
اور قانون میں دُوسری بار تبدیلی کی جا رہی تھی
کہ وُہ جس کی آواز ہو اور نہ تصویر ہو
مارا جائے تو پھر
تعزیت کی عبارت میں کیا فرق تحریر ہو!!

ANGISED

یہ گولی'
سینۂ بیمار میں جب
سینہ بھر کی پھانس رہ جائے
زباں کے نیچے نیچے
زِندہ رہنے کی اداکاری سکھاتی ہے
مرے حلقوم کی اِس تنگنائے سے گزرتی ہے
بہت ہی ریزہ ریزہ رُوپ کے بہرُوپ میں
جیسے اِسے معلوم ہو کس اَنت پر اَنجام ہونا ہے
کبھی تالو، کبھی تلوے گھماتے
آتے جاتے شہر میں
معدوم کے کس کھوج میں سامان ڈھونا ہے
زباں کے نیچے نیچے آدمی آباد ہے'
یہ جانتی ہے

جبھی تو بول بھی پڑتی ہے:
آٹھوں پہر چٹخارو ں پہ
کوئی روک ہونی چاہیے تھی
بے خطر جُغرافیوں کی یم بہ یم اَجناس پر،
بے وقت کا مُنہ مارنا،
تاریخ دسترخوان پر رکھی ملی تو کیوں لگا
سب ختم ہی کر کے اُٹھو گے، سنتے ہو!
اسطورہ کوئی جانور جھٹکے کا تھا اور کھایا جاتا تھا
تمھارے گھر میں، ناغے کے دنوں میں بھی
تمھیں ہڑتال پر بھیجا گیا اور تم نے
چٹخارے نہیں چھوڑے
ادھر یہ گولی کیا کیا جانتی ہے میرے بارے میں
اُدھر لیکن مری تاریخِ پیدائش نہیں ثابت،
حکومت کے کسی ریکارڈ سیل میں بھی
بدن ثابت نہ دِل ثابت
میں اپنے آپ میں جیسے عدم آبادوں کا شوشہ
عدم موجودوں کی بولی
یہ گولی،
ہائے یہ گولی یہ گولی!!

مجسّمے کا مجسّمہ

برہنہ تھی اور سَر جھکائے ہُوئے'
فرش پر کیسی موجود غائب پڑی تھی
کہ جب میں نے دوبارہ دیکھا اُسے
اُس کو تیاری میں سات دِن لگ گئے
کیا غضب تہَ بہ تہَ تھی
مگر مجھ کو تو ایک ہی تہَ میں درکار تھی
سَو پرت پردگی سے پلٹنے میں ہفتہ لگا
آٹھویں دِن وہ کمرے میں آئی
تو اپنے عقَب ہی میں آئی
وہیں میں نے ہاتھوں کے پنجوں کو پھیلایا
دسؔ اُنگلیوں کے خلا سے' اُسے جھانک کر
ایک جغرافیے کا جمود اس پہ طاری کیا
اور سُکُوت ایک تاریخ کا اُس میں جاری کیا

تب وہ قابل ہُوئی
میری تفہیم کے، اپنی تجسیم کے
میں نے ہاتھوں کو مٹّی میں ڈالا
یا مٹّی کو ہاتھوں پہ ڈالا
اِدھر سے لپائی پتائی چلی
رنگ روغن کی راوی
مِری اُنگلیوں کے خلا کی بھرائی چلی
اور اُدھر آب و گِل نے جو قدِ بلوغت نکالا
تو میں نے ہَوا میں تمسخر کا تودہ اُچھالا
یہیں بس یہیں پر ترا کام پُورا ہُوا
میرے تاریخ جغرافیے سے نکل آ،
چلی جا زمانے میں واپس
مگر ہاں، وہ ساری تہیں اور وہ پرتیں
جو کمرے کے باہر پڑی ہیں
تجھے اَب نہیں مِل سکیں گی، وہ میری ہُوئیں
اَور یہ لے، جھپٹ لے مِری جیبِ تہ دار پر
اِن سُرنگوں پر اِس غائب غار پر
اِن میں جو کچھ بھی ہے، سارا تیرا ہُوا!

وقت ہا وقت کی خاک آلود تکرار سے میں گزرتا رہا
اور وہ مُورت،

مِرے فرش و فرسنگ پر سَر جھکائے
مِری رفت و آمد کے ہر بھُربھُرے،
ہر کٹیلے نکیلے چلن پر
عجب آبرو کُش ہنسی ہنسنے والی
جمود اور سکوت اَپنا خطرے میں ڈالے
الوہی بھرم کو ذرا داؤ دے کر،
غرض پر غرض داغتی میری جانب
کہ اَے تہ بہ تہ آدمی،
تو مجھے ایک تہ میں، اُکھرا ہی آج اور ابھی
اِس تماشے میں درکار ہے!
تب میں کیا دیکھتا ہُوں
سیاہ و سُفید و حریم و کریم
اچھی اچھی مِری ساری پرتیں اکھڑتی ہیں
ہر روز کی ایک ــــ پھر ایک، پھر ایک
قرنوں میں قرنوں برابر
جمادات کی جیم کا حاشیہ
جیسے واوین باہم لپیٹے ہُوئے
جیسے قوسین ہوں دُو سمیٹے ہوئے؛ یعنی میں
وُہ یقیں کرتی ہے کھنکھنا کر مجھے
اور سُنا کر مجھے
میری آوازِ گم گشتۂ شرم کو، سازِ نا شرم کو

گھول دیتی ہے مٹّی کو پانی میں
دسؔ اُنگلیوں کے خلا میں وہ کیچڑ کو بھرتی ہے
اور تھوپ دیتی ہے تولیدِ نر کی وہ فن کاری
فرشِ زمیں پر
کہ جس کے لیے سَر اٹھایا تھا اُس نے
تو دوؔ ہاتھ بدرنگ سے بھر لیے تھے
اَب اِس چھت کی چھاننی میں دوؔ مورتیں ہیں
گماں گشت ننگا مکاں بخش ننگی
مگر تیسرا مَیں ہوں
اور چوتھی ہے یا کہ پہلی ہے وہ
— وہ جو کمرے کے اندر نہیں
اور کمرے کے دروازے پر جس کی اُترن پڑی ہے
زمانے کے فرشوں پہ سَر کو جھکائے
گڑی ہوگی جانے کہاں
وہ تہِ آسماں، میں بھی جاؤں وہاں
مورتوں کو کوئی دِن اکیلے میں
اِک دوسرے کو سمجھنے کا موقع ملے
میں چلوں، میں چلوں تو
مگر میرے کپڑے!!

نہ کوئی اَبجد نہ کوئی مضموں!

ہم اَپنے مجرم کا پُوچھتے ہیں
کہ پُوچھنا سائلوں کا حق ہے
زباں زدِ عام نامۂ اِنعام
آج لاگو نہیں رہے کیوں
سوال نامے کا صَفحہ صَفحہ
بھرا بھرا بے تمیز جنگل ہے
اپنی دُھن میں دہاڑتا ہے
کہ ترکِ آدم کی حلقہ بندی میں
فوج کی فوج منتشِر ہے
زمیں کو پنجوں میں گاڑتا ہے
پکارتا ہے کہ قوم کی قوم غیر اِنساں

نہ کوئی اَبجد نہ کوئی مضموں
نہ اَندرُوں ہَے نہ کوئی بیروں
کَشاں کَشاں جاری قہرِ انساں
جواب آئے کہ آدمی ہَیں
شنید و گفت و گزشت کے
داستاں بریدہ محاورے تو نہیں
جو کم کلام کرنے پہ آپ
متروک ہو گئے ہوں
لغت کے اَندر سوال کی نیند
سو گئے ہوں
مگر جواب آئے بھی کہاں سے
ہمارا مجرم کوئی نہیں ہے
کوئی نہیں اَور ہر کوئی ہے
کوئی نہیں جو کہ ہر کوئی ہَے
ہمیں مصیبت بنا ہُوا ہے
کب اُلٹے قدموں سے واپسی ہو
کب اُلٹی آنکھوں سے دیکھنا ہو
عقب کا جاروب کَش ہیُولا
جو پیش پا کے سبھی خلائق کو ہانکتا ہَے
تو کتنے ہم جیسے ہَیں جو سرپٹ'
زقندیں بھرتے، پھلانگتے ہَیں

—بغیرِ پاپوش و تسمۂ پا
یہ سنگ و فرسنگ کے تبرک
کوئی نہیں یعنی ہر کوئی ہے
عقب کا اِنسان کُش بگُولا
جو اَپنی جھاڑو سے، اَپنے چابک سے
نفی اور نفی کے تعلق کو جوڑتا ہے
یا جمع کا زور توڑتا ہے!

لام کا لٹّو

کوئی تو میرے چکّر گن رہا تھا
ہفت سامانی کے داؤ اور دباؤ پر چلا' چلتا رہا
کیسا چہار آغاز تھا میرا' ہزار آغاز تھا میرا
مگر پھر بھی
قدم ایسے اُٹھاتا تھا کہ جیسے
ختم ہو جانے کا خدشہ ہو
میں چکّر پُورا ہوتا بھی ادھورا چھوڑ دیتا
اگلے پھیرے کے لیے
اور اگلا پھیرا اگلے چکّر کے لیے
روح و بدن کا ہم ادا مجمع' بس مجمع
ہزاروں منتشر اور مشتہری ٹولیوں کو کاٹتا

پر اَور کتنا کاٹتا
سَیر و سفر کی بوریت حاوی ہُوئی جاتی تھی
کچھ کم بھی تو کرنی تھی
سو اَپنی ہفت حالی کے رَم و رفتار پر
اُنگلی اُٹھا ڈالی
محیط و مرکزہ سے مستیاں اٹکھیلیاں سُوجھیں
ہنسا اور پھر کَن اَنکھیوں سے
نظر دوڑائی اُس گنبد کی گولائی پہ،
جیسے ایک تنہائی
اچانک دُوسری تنہائی کو دیکھے تو پُوچھے:
اے ری ساتھی!
مجھ سے تم نے حادثے کا جھوٹ بولا
اور علیحدہ کر لیا سارے میں
چوراہے کو، چوبارے کو
بولو، یاد آیا ـــــ
میں وُہی اُس ایکتا کا لخت لخت
اور فرد فرد اِنسان ہُوں،
اِنکار ہُوں!
میری کُٹھالی بھی الگ،
میری رُکابی بھی الگ یارا!
مِری مدِمقابل ساتھی تنہائی

جو بولی بھی تو بس اتنا
کہ ہاں سب ٹھیک ہے، پر سُن عزیزم
سایہ سایہ سہ پہر میں
ایسے دُشمن دائروں میں گھومنے
تو ہم ہم آیا کرا
خدا کا کام بڑھ جاتا ہے
تیرے اُوپر اُوپر دیکھنے سے
اور دکھانے سے
زمیں آسمانی بے مزہ چکر لگانے سے
ابھی خرمستیاں جاری تھیں
دو بچھڑے ہوؤں میں
عقب سے اک ہجوم آیا
— غصیلا، نام کا نیلا
مرے کانوں میں گونجا:
او اے او
لاز ماں کے، لام کے لٹو
چل آگے بڑھ
کن انکھیوں سے نشانہ باندھ کر
ساری ٹریفک روک کر، کیسے کھڑا ہے!!

جنگلی بحثیں

ہمارا خون ہے
اِنسان کو ہم کیسے بھولیں
گنہ کے چھوٹے موٹے فرق سے
یہ نسل تھوڑی اَور ہے تو کیا
اَب ایسا بھی نہیں اس فرق پر
ہم سَرپرستی ہی سے پھر جائیں
ہمیں بھی تو کسی کو مُنہ دِکھانا ہے
الف بے جیم ہا ہا ہا ہہ، ہا، ہا — یائے 'یا' 'یکہ'
اگر اَیسا ہے تو ہم باز آئے اِس حکومت سے
ریاست میں ریاست بن چکی
اوِر سب کے سب چُپ ہیں

سُنا کچھ، ہم نشینو! قہقہہ دَر قہقہہ دَر قہقہہ آدم

کہ جیسے رزمیہ ہو رَدِ آدم کا

ہم اپنے سامنے پروان چڑھتے

دیکھتے تھے اس کی عُریانی

ہمیں معلوم ہے اِس نے کہاں

کیا شے چھپائی ہے

الف بے جیم کا جنما قتالی قاف کا پکّا

الف بے جیم، ہو ہو ہو

مِرا دِل تو یہ کرتا ہَے

کہ اَب کُرتے کے بٹنوں سے

یا پاجامے کی مہری سے

اگلوالیں وہ سب چالیں

جو اَب تک چلتا آیا ہے

وہ ڈھالیں اَور وُہ سارے عقَب

جو پُشت سے چپکائے پھرتا ہَے

تو پھر دیکھیں گے اوندھے مُنہ

یہ کِس جنّت میں گِرتا ہَے!

الف بے جیم، چ چ چ، یہ دلاّلی کا دھکّا

نہیں اَیسا نہیں کرنا

خُدا کے ماننے والے ہو تم، اَیسا نہیں کرنا

اِسے کچھ دِن کی مہلت اَور دیتے ہیَں

کہے دیتے ہیں: بھائی، یہ مذاق اچھا نہیں !
جنسی بھی، ناجنسی بھی
ناراضی کی مشقیں ___ جنگی مشقیں
اَور بلوہ، اَور غزوہ
خیریت کے خالی خط
کاتب سے لکھوانا، گھروں کو بھیج دینا
اَور کہنا: دیکھا، کیسا حمدیہ خط ہے !
مذاق اَب ختم، بے مضمون حمدیں ختم
گھر واپس پلٹ آ،
ایک موقع اَور دیتے ہیں !!

دُنیا بیگم

تجھے جہاں سے بھی چاہتا
میں اُداس کرنے کو کر تو سکتا تھا
میرا حق تھا، تُو میری شے تھی
مگر میں ان بے حساب نقطوں پہ
دائرہ وار چلتے چلتے،
یہیں کہیں نونِ ناف کے اِک
نشیبِ تر پر پسر گیا ہوں
مسہری پر میرے بائیں تھی تُو دراز، دنیا
کہ جب میں کروٹ برائے کروٹ
بدل رہا تھا!
سرہانے سیٹی بجاتی تنہائی تھی
کہ جو پائنتی کی خلقت نے بھی سُنی
اور جُھرجُھری لی تھی،

نیند کو اعتبار بخشا تھا'
اپنے حصے کی جنگ کی تھی
تجھے جہاں سے بھی چاہتا
بے لباس کرنے کو کر تو سکتا تھا
سب مرا اعتبار کرتے
مگر بس اِک لمس کی لپک پر دراز دُنیا'
یونہی ترے نُون نعل کی پردگی کو حلقہ
کیے ہوئے اَندر آ گیا ہُوں
یہ اَندرُونے کے چار کونے
مکانی بے داد کے بچھونے
گلی گلی انتہا کی بخشیں
یہ گھر نہیں نکتۂ نہایت کی دُھول ہیَں
پھُول ہیَں — کتابوں میں رکھّے رکھّے
جو عُمر کے بہترین دِن
حاشیوں کی چوکھٹ پہ کاٹ دیتے ہیں
سطر سے سطر کی لڑائی میں'
دُور ہی دُور' اوڑھنی کے دھاگے مکیں نہیں ہیَں'
یہ چاک چاک اوڑھنی کے بخیے
کہ جیسے ڈھلتے دِنوں میں لمبی لنگور پرچھائیں
اُور پرچھائیں کی دراڑیں
مجھے تو اِس اوڑھنے بچھونے سے لگ رہا ہَے

نگر میں ہم بستری کی نامی کوئی روایت
رہی بھی ہو گی تو اَب نہیں ہے
شٹر دُکانوں کے بج رہے ہیں،
دُکانیں چُپ ہیں
رباب یہ میزانیے کا غَوغا تو سب یہ سُن لیں
ازار بند اَپنی جمع تفریق میں پڑے ہیں
پراندے کا اِشتہار چلتا ہے، اور
چنریا سرک رہی ہے
میں چل رہا ہوں
تجھے جہاں سے بھی چاہتا
میں تمام کرنے کو کر تو سکتا تھا
تیرے ناگفتہ شورِ سر سے
سُکوتِ پا کے ہر اک سخن تک
میں تیرے بارے میں جانتا ہوں
مگر کہیں وقفۂ وضاحت میں
دے رہا ہوں بیان اپنا
وُجود کے لاوُجود پر ٹکٹکی لگی ہے
مسہری پر میرے دائیں ہے
تُو دراز، دُنیا!!

غٹ غٹا غٹ غُوں!

سے کوئی بھی ہو
ہم دوڑتے ہیں پانی بھرنے آج بھی اُلٹے قدم،
اُس باغ کی جانب
جہاں رہداری میں بُوڑھے کنویں کی لاش رکھی ہے
عجب اک بے نیازانہ سی تہ داری ہے
ڈیڈ باڈی کی ٹھنڈی ٹھار،
خانہ دار تاریکی کے بیچم بیچ
اوِ پاتال کی زاری میں جاری غٹ غٹا غٹ غُوں
کئی غرقاب ـــــ جُوں کے تُوں
ہم آتے ہیں کہ جیسے نامقرّر ڈولچی،
اِس نامقرّر ڈول کا ذِمّہ اُٹھائے،
رَہٹ میں چلتا چھناکا، چھب کا محرم
رُوح کو اپنے شکم سے باندھ کر رسّی بندھ جائے

غٹا غٹ، غُوں

یساروں اور یمینوں میں پڑی پینگھیں
شگن رُکتے نہیں ہیں کیوں!
سمے دو وقت ملنے کا ہو یا مل کر بچھڑنے کا
یہ ہم نے فرض کر رکھا ہے
جُھوٹھے میں شِفا ہے ـــ اور
یہ سیری اور سیرابی کے سایے ـــ اور
پیالے سے رگڑ کھاتا پیالہ
اُوک، آگے اُوک، پیچھے اُوک
گھیرا ہے کہ گھیراؤ
کوئی اِس کارگاہِ آب و گِل کے کام نمٹائے تو گھر آئے
اُدھر اس باغ سے باہر کھڑی سرکار کہتی ہے
کہ سیرابی بھی کوئی مُنتہاؤں میں سے کارِ مُنتہا ہے
چھوڑ دو تہذیب کا چھوڑا ہُوا تعمیر کا جوڑا ہُوا جُھوٹھا
گرہستی اور گھرداری کے گھونٹ اَب تھوک بھی ڈالو
تمھیں بیٹھے بٹھائے شہر میں سرکاری پانی مل رہا ہے
جاؤ، اُس کو آزماؤ
راستے سے لاش اُٹھاؤ!!

چینی کی چادر

نیند پوری ہو گئی کیا؟
مجھ سے چینی نے کہا'

رات کی اوندھی پہاڑی پر
وہ رات آئی مجھے
میری کروٹ کا اُٹھایا فائدہ
مجھ کو ہلایا تک نہیں
سو رہا ہوں گا میں برسوں کی بُنت کاری کے بعد
اور وہ آیا ہو گا اپنی شال اوڑھانے مجھے
جال پھیلاتے ہوئے لرزا بھی ہو گا ایک بار
گو دِکھاوے کو سہی!

لیکن خُدا کو ذہن میں لا کر،
حقیقی کپکپی طاری ہُوئی ہوگی
شکن اَندر شکن بَل کھولتے
کچھ پائنتی سے، کچھ کمر سے،
کچھ سرھانے سے
سگھڑ ساجن
اُڑا پھرتا رہا ہوگا اُفق سے تا اُفق
اور بھر گیا ہوگا اُسی سے
اُس کی چادر سے وہ غار
غار اَندر غار، باہر غار
رات کا اُلٹا پیالہ
کارخانہ ــــ آدمی دَر آدمی
دَھندے کا دَھندا، دھَن کا دھَن
سب کچھ تہ و بالا، مشینیں بند ہیَں
اَب اِس جگہ کپڑا نہیں بنتا
وہ گھبرایا نہیں ہوگا
مجھے کروَٹ دِلائی ہوگی اُس نے
یا نشِست اپنی بدل لی ہوگی
چادَر نے ذرا سی جھرجھری لی ہوگی
پھر وُہ سو گیا ہوگا کہ جیسے مَیں ــــ
کہ جتنا مَیں

وہ جس کا سُنتے آئے تھے مِرے جیسے
کہ اُس کو اُونگھ بھی آتی نہیں!
چرخا گھُماتے
پونی پونی دَہر کا ریشم بناتے
ہم نے مِل کر نیند لی ہو گی
گزشتہ کی تلافی نیند
ناکافی ٹُکڑوں میں نیند ـــــ کافی نیند!

اور پھر ایک دِن جب کارخانے کی جگہ
جنّت کا نقشہ بن رہا تھا
اُور غوغا تھا کہ جو جس حال میں ہے،
اُٹھ کھڑا ہو!
ہم اُٹھے، چادر اُٹھائی
اور وہاں سے بھاگ نکلے
دوزخی تھے، جنّتی تو تھے نہیں!

نیند پُوری ہو گئی کیا ـــــ
راستے میں مجھ سے چیونٹی نے کہا،
میں نے بھی اُس سے کہا!!

اَے مِری میزباں!

مِرے پاس اتنی ہی مُہلت تھی
جتنی کہ چائے کی چُسکی میں آ سکتی تھی
میں پیالی کے پیندے میں
اس آخری گھُونٹ کی طرح
کب تک بچا رہتا
اور منتظر رہتا اعلان کا:
دَور پُورا ہُوا
چند لمحوں میں اگلا چلے گا
پھر اگلے سے اگلا
سو خواتین و حضرات،
اپنی نشستیں نہیں چھوڑیے گا!

ذرا پہلوؤں کو بدل لیجیے
مشرقی مغربی مغربی مشرقی
جیسے بھی بَن پڑے
فرش اُٹھے اور چھت کو چھوئے
اپنے اپنے اُفق، اپنے اپنے عمُود
اِک ذرا قابو کر لیجے
بانہوں کے گھیرے میں
جانے نہ پائیں!

میں کب تک کنارہ کٹھالی کا
خالی پیالی کا
دانتوں میں دابے ہُوئے
بیٹھ رہتا ترے رُوبرُو
منتظِر رہتا اَحکام کا
میں نے سوچا گرا دُوں یہ باقی کی چائے
ترے میز پوشوں کی پھلواریوں پر
اور اعلان سے پہلے ہنگامی یا اِنتقامی
قدم جیسے تیسے اُٹھالُوں
لُنڈھا دُوں عجائب کا سیلا یہ غائب کا گیلا
گِل وگُل پہ، ہر سبزۂ کُل پہ
ہر گرم، ہر سَرد کو

اِس روِش پر کھُلے عام چھوڑوں
تجھے ٹوٹتے برتنوں کے چھناکوں سے توڑوں
مسائل کی مکتی
ترا شیشۂ ایکتا
ایکتا کتنا ہلکا ہو اور کتنا بھاری
یہی سوچ رکھا ہے اور زندگی ڈھل رہی ہے
برابر میں چائے پہ چائے
یونہی چل رہی ہے!!

بہت یاد آئی۔ "زوال" کا مرکزی کردار تو یہاں تک کہتا ہے کہ آنے والا موٴرّخ ہمارے بارے میں صرف ایک جملہ لکھے گا اور وُہ یہ کہ "اِس عہد کا اِنسان اَخبار پڑھتا تھا اَور گناہ کرتا تھا"۔۔۔ تو اِس ایک جملے نے بیسویں صدی کے وَسط کے یورپ کو بالعموم اَور فرانس کو بالخصوص چوراہے میں پٹخ دیا تھا۔ "دَرَس دَھارا" کی نظمیں بھی ایک نوَع کے عالَمِ آشوب کا حکم رکھتی ہیں ۔۔۔ اخلاقی اَور سیاسی زوال پر غضب آمیز ماتم!

گویا شاہین عبّاس بھی عہدِ حاضر کے اُس سوادِ اعظم سے منسلک ہے جو جغرافیے پر تاریخ کے تسلّط کو شِدّت سے محسُوس کرتا ہے۔ اُس نے اِن نظموں میں ایک نئی زبان وضع کی ہے۔ وہ اپنے اَندر موجود غزل گو سے پہلوتہی کرتے ہوئے ایک نئے آہنگ سے گویا ہُوا ہے۔ ایسی نظمیں کسی منصوبہ بندی کے تحت تکمیل پذیر نہیں ہوتیں، یہ تخلیقی وُفور کی بارِش میں اپنے خالق کا بازُو پکڑے اُسے جہاں چاہیں لے جاتی ہیں اَور شاعِر بازُو چھُڑانے کی کوشش نہیں کرتا : وُہ نیم وا آنکھوں سے شعُور اَور لاشعُور کے مابَین جھولتا دِکھائی دیتا ہے۔

شاہین عبّاس کے ہاں علامتوں اَور اِستعاروں کا ایک منفرد نظام متشکل ہُوا ہے جو اَنوکھا بھی ہے اَور مشکل بھی۔ اِن نظموں پر کہیں کہیں شاعری کی مانُوس جمالیات سے اِنحراف کا اِلزام بھی لگ سکتا ہے ۔۔۔ آپ اِنھیں قبول کرتے ہیں یا نہیں، ہر دو صُورتوں میں آپ پر تفہیم کی ذِمّے داری عائد ہوتی ہے؛ اگر آپ یہ ذِمّے داری قبول کرتے ہیں تو "دَرَس دَھارا" کی نظمیں ضرور پڑھیے!!

۔۔۔۔۔۔۔ شناور اِسحاق

ISBN 978-969-8527-86-0